ہے، صفیر کی محرستان خیال کا جو حصہ فاضل مصنف نے نقل کیا ہے، وہ اہم اور خاصے کی چیز ہے، اس کا جوابی حصہ بھی جو مرزا آزاد کی تضمین پر مشتمل ہے، ادبی دلچسپی کا سامان ہے، آخر میں غالب کی دو غزلوں اور ایک قطعہ پر صفیر کے مخمسات دیئے گئے ہیں، اور سب کے آخر میں متفرقات کے زیر عنوان وہ معلومات درج ہیں، جو فاضل مصنف کو کتاب کی اشاعت کے دوران میں حاصل ہوئے، غالب و صفیر کے تعلقات کے سلسلہ میں جو منتشر مواد پہلے سے موجود تھا، اسے اور اس کے علاوہ بہت سی مزید چیزیں بھی اس کتاب میں بہت خوبی اور مناسب ڈھنگ سے یکجا کر دی گئی ہیں، اور اس موضوع پر ابتک جو کام ہوا ہے، اس کی خامیوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے، لائق مصنف نے یہ تمام معلومات خود صفیر کے حوالہ سے لکھے ہیں، مگر ان کے غلط بیان کی تصحیح بھی کر دی ہے، اور مختلف نسخوں کے فرق و اختلاف کی صراحت بھی کی ہے، یہ کتاب علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اور اردو کے ذخیرہ میں اچھا اضافہ ہے۔

مکاتیب عبدالحق بنام محوی

مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸، قیمت چھ روپے، ناشر، انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱۔

جناب محوی صدیقی بھوپال کے ممتاز اہل قلم تھے، انہیں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے ساتھ برسوں رہنے اور اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا، اس لئے دونوں میں اکثر خط و کتابت بھی ہوتی تھی، اب جناب عبدالقوی دسنوی کی کوشش اور تلاش سے محوی صاحب کے نام کے بابائے اردو کے تقریباً تین درجن خطوط کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا ہے، شروع میں ان کے قلم سے دو مختصر مضامین بھی ہیں، ایک میں مولانا محوی کے حالات و واقعات اور انکی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کئے گئے ہیں، اور دوسرے میں ان کے اور مولوی عبدالحق صاحب کے تعلقات اور خطوط کی خصوصیات دکھائی ہیں، بابائے اردو کی پوری زندگی اردو کی خدمت و ترقی کیلئے وقف رہی ہے جسکا ان خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی اشاعت بھی اردو کی مفید خدمت ہے۔ "ض"

جلد ۱۳۲ ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۳ء عدد ۴

مضامین

شذرات

جولائی کے معارف میں یہ اطلاع دی تھی کہ یہ خاکسار مسلم انسٹیٹیوٹ لندن کی دعوت پر وہاں ایک سیمینار میں جا رہا ہے، یہ سیمینار ۱۰ اگست تک ختم ہوگیا، مگر مزید قیام کی وجہ سے واپسی ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء کو ہوئی، سیمینار کا موضوع "اسلام میں ریاست اور سیاست" تھا، اس میں اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے، مگر سیمینار سے باہر عام فضا پر ایران کا موجودہ انقلاب چھایا رہا، کچھ لوگوں کی زبان پر تو یہ تھا کہ یہ سراسر اسلامی انقلاب ہے جو اس دور کا عظیم الشان واقعہ ہے، کچھ لوگ اس رائے سے بہت زیادہ متفق نہیں تھے اور کچھ لوگ دعا گو تھے کہ اس کا رخ کہیں ایسی سمت نہ ہو جائے جو دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی توقع کے مطابق نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ آیت اللہ خمینی نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، مگر ان کا دل بھی دھڑک رہا ہوگا کہ کہیں طاغوتی طاقتوں کی وجہ سے یہ انقلاب غیر اسلامی نہ ہو جائے، لندن کے قیام میں اس کی حمایت اور مخالفت میں جو باتیں سننے یا پڑھنے میں آئیں، وہ خاکسار کے سفرنامہ میں درج کر دی گئی ہیں، یہ معارف کی زیر نظر اشاعت سے شروع ہو رہا ہے، اس میں سیمینار کی تفصیلی روداد بھی ہے، دعا ہے کہ ایران کا انقلاب صحیح معنوں میں اس معیار کے ساتھ اسلامی ہو کہ دوسرے اسلامی ممالک بھی اس کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھیں، ورنہ اس کی ناکامی سے کہیں وہاں کوئی اتاترک مصطفےٰ کمال یا بابرک کارمل نہ پیدا ہو جائے،

سیمینار کے بعد لندن میں ۴۲ روز اور قیام رہا، اس کی زندگی کے ملے جلے اثرات پڑے، مذہبی عیسائیت تو وہاں شاید ختم ہو چکی ہے، سیاسی عیسائیت حکومت کے سہارے باقی ہے، یا کتابوں میں ہے، روزمرہ کی زندگی میں تو نہیں ہے، گرجا گھر عموماً ویران رہتے ہیں، بپتسمہ یا شادی کی تقریب کے موقع پر آباد ہو جاتے ہیں، اب تو مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت بھی ہونے لگے ہیں، اب یعنی شراب خانے جا بجا بہت آباد رہتے ہیں، عورتیں مردوں کی طرح آزاد ہیں، وہ جو چاہیں کریں، ان پر کوئی پابندی نہیں، ان کے یہاں

حیا، شرم، ستر اور عصمت شاید بے معنی چیز ہے، عریانی اور فحاشی کا معیار ان کا اپنا ہے جس پر کوئی روک ٹوک نہیں، وہاں کے لوگوں نے اپنی زندگی کے جو ضابطے بنا لئے ہیں، وہی ان کا مذہب بن گیا ہے، وہ اس کی فکر نہیں کرتے، کہ یہ عیسائی مذہب کے مطابق ہے بھی کہ نہیں، پادریوں کی دارو گیر سے اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں، وہاں کے قیام میں بار بار خیال آیا کہ جہاں مذہب ایسا بے بس اور عاجز ہو رہا ہو، وہاں کا معاشرہ کب تک صحت مند اور توانا رہ سکتا ہے، اس کا فیصلہ تو آنے والا زمانہ ہی کر سکتا ہے،

ان کی زندگی کے دوسرے پہلو بھی سامنے آئے، لندن کے علاوہ برمنگھم، کیمبرج اور آکسفورڈ بھی جانے کا اتفاق ہوا، ہر جگہ ایک اولوالعزم اور بلند پایہ قوم کے آثار پائے، برٹش میوزیم میں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ یہاں ایک کروڑ بیس لاکھ کتابیں ہیں، ہر سال اس میں چھ لاکھ کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے، انڈیا آفس اپنی گذشتہ عظمت کے ساتھ قائم ہے، اس میں بھی تین لاکھ کتابیں ہیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سارے ریکارڈ اور ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے نادر مخطوطات ہر طرح محفوظ ہیں، لوزاک اینڈ کو اور بریل کی دکانوں میں اسلام پر ہر قسم کی کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں جو زیادہ تر یورپین مصنفوں کی ہیں، یہ اپنے خاص رنگ میں اسلام کو پیش کر کے اپنی سیاسی مطلب برآری کی فکر میں لگے رہتے ہیں، بی۔ بی۔ سی۔ لندن بھی دیکھنے کا موقع ملا، یہ سن کر حیرت ہوئی کہ یہاں اکیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں، تب ہی تو یہ ابلاغ کا ایک غیر معمولی ذریعہ بنا ہوا ہے، یہاں سے ۳۵ زبانوں میں روزانہ خبریں براڈکاسٹ ہوتی ہیں، اخبارات بھی وہاں ایک بڑی طاقت ہیں، ٹائمس کا سنڈے اڈیشن ۵۰ صفحے کا دیکھا، اخبارات کا لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونا کوئی بڑی بات نہیں، جس علاقہ میں میرا قیام تھا، وہاں کے حلقہ کے ایک ہفتہ وار اخبار ردم فورڈ انڈپنڈنٹ کی اشاعت تہتر ہزار چار سو پچاس تھی، ماہانہ ریڈرز ڈائجسٹ کی اشاعت ۳۲ ملین ہے، اور یہ سولہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے،

وہاں کے شوپنگ سنٹر میں اربوں کا مال نمائش کی طرح سجا سجایا رکھا رہتا ہے، اس کے سنیکڑوں

اسٹال پر کوئی نگراں نہیں ہوتا ہے خریداروں کی دیانتداری پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی وہی چیز اٹھائیں گے جس کی قیمت وہ کونٹر پر ضرور ادا کر دیں گے، دکانوں، دفتروں اور کارخانوں میں کام کیا ہوتا ہے کام کی پوجا ہوتی ہے، ہر شخص کام میں پوری احساس ذمہ داری سے منہمک ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہ اب بھی وہ اپنی محنت سے صنعت، حرفت، طب، علم اور سائنس کو کیا کیا چیزیں نہیں دے رہے ہیں، سائنس کی چھوٹی بڑی ایجادات، اور خصوصاً کمپیوٹر کے ذریعہ سے گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام پاجاتا ہے، سڑکوں کے کنارے بینک ہوتے ہیں، وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا، کوڈ، اکاؤنٹ نمبر، چک پر رقم کی تعداد لکھ کر ایک کونٹر کے اندر ڈال دیا جاتا ہے، اور رقم فوراً نکل پڑتی ہے، سڑکوں پر ہر ایک میل پر ٹیلیفون لگا رہتا ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتا، بجلی کبھی فیل نہیں ہوتی زمین دوز ریل ہر پانچ منٹ پر آتی جاتی رہتی ہے، ہر دو تین منٹ کے بعد ایک اسٹیشن آتا ہے، سڑکوں پر چلنے والی بس کے اوقات بھی مقرر ہیں، جس میں کبھی فرق نہیں آتا، ہر جگہ لکھا ہوا ہے کہ اپنے خوبصورت برٹین کو صاف رکھیے، اسی لئے پورا لندن آئینہ کی طرح شفاف نظر آتا ہے، لندن یا کوئی گاؤں ہو، ہر جگہ کی سڑکیں بہت صاف، مسطح اور ہموار دکھائی دیں، کھیت کیا تھے ان پر مٹی کا فرش بچھا ہوا دکھائی دیا،

.....

برنگھم گیا تو کارخانوں میں صنعت و حرفت ڈھلتے دیکھا، کیمبرج، اور خصوصاً آکسفورڈ کے راستے کو تو صحیح معنوں میں جنت سواد پایا، کیمبرج تو علم و فن کا مرکز بنا ہوا ہے، آکسفورڈ سے نظر و فکر کی کرنیں ہر جگہ پہونچتی ہیں، ان دونوں یونیورسٹیوں کی شان و شوکت دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ان کی بنیاد ڈالنے والی قوم کو زندہ رہنے کا حق ہے، اس سارے جمال کی تفصیل خاکسار کے سفر نامہ میں ملے گی،

.

پیرس بھی گیا، بعض اسباب کی بنا پر بہت عجلت میں وہاں پہنچا، اور واپس چلا آیا، جناب ڈاکٹر حمید اللہ سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکا، جس کا افسوس زندگی بھر رہے گا،

مقالات

ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات

از

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (دہلی)

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان سے اب تک جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں ایک ہی قسم کے خیالات کا اعادہ بار بار کیا گیا ہے اسلئے زیر اشاعت شمارہ میں ان میں کے بعض مضامین کے خاص خاص اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ "معارف"

"مستشرقین" کے نام سے یورپ اور امریکہ کے جن دانشوروں کو یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے، کہ یہ جماعت علوم و فنون کے شائقین کی ہے، سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپ قرونِ مظلمہ کی تاریکی سے باہر آیا، اسلامی ممالک خصوصاً اندلس کے علمی خزانوں کے جواہرات اس کے قبضہ میں آئے، اور وہاں علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو یہ اس کی طرف لپکے، ان میں سے ایک جماعت نے علوم اسلامی کو اپنا موضوع بنایا۔ تفسیر و حدیث و سیرت سے متعلق نایاب کتابوں کو جاں فشانی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ شوق و محنت کے ساتھ مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے کیے اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کرا کر مشرق و مغرب میں پھیلایا۔

جس طرح ریگستان میں بھٹکنے والا تشنۂ آب سرد و شیریں کا چشمہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے، یہ تشنگانِ علم اسی طرح ان علوم پر ٹوٹے، اور انھوں نے اپنی علمی پیاس بھی بجھائی۔ اور دوسرے کو بھی

سیراب کیا۔ مسند امام احمد بن حنبل اور طبقات ابن سعد کی تدوین وطباعت کے سلسلہ میں مارگولیتھ اور
پروفیسر سخاؤ قابل تشکر ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دانشور ہیں جنھوں نے ایشیا اور افریقہ پر مغربی
اقوام کے اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے انسانی
اور اسلامی علوم وفنون کی طرف توجہ کی، جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ہوا
کہ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اور دہلی میں انیسویں
صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی کالج اور اس سے متعلق دار الترجمہ کی تاسیس کی گئی۔ جہاں ایک طرف
انگریزی حکومت کی مشینری کے لیے ہندوستانی پرزے ڈھالے گئے تو دوسری طرف نووارد مغربی
حاکموں کو اپنی مشرقی رعایا کی زبان، تاریخ وتمدن وتہذیب سے روشناس کرانے کا سامان کیا گیا۔
مستشرقین کی فہرست بہت طویل ہے۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب سیرۃ النبیؐ کے
حصہ اول کے مقدمہ میں بہت سے نام گنائے ہیں۔ اور اب نصف صدی گزرنے کے بعد، ان میں
خاصہ اضافہ ہو چکا ہے، اس لیے سب کے متعلق کوئی ایک حکم لگانا انصاف سے بعید ہے، تاہم یہ حقیقت
ناقابل انکار ہے۔ کہ ان میں بہت بڑی تعداد ان متعصب مصنفوں اور پادریوں کی ہے جنھوں نے
فلسطین کے میدان میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں، ممالک یورپ کے مشترکہ عیسائی لشکروں کے شکست
کھانے کے بعد محاذ جنگ تبدیل کیا، اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف قلمی جنگ شروع کی اور ان کے
روئے روشن پر ایسی کیچڑ اچھالی کہ انسانیت وشرافت کا سر شرم وندامت سے جھک گیا۔ اسی مقصد کو
منظم طریقے پر پورا کرنے کے لیے بعد میں انھوں نے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں تحقیقات علوم اسلامی
کے نام سے ادارے قائم کیے۔ اب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں۔ اس لیے طریقۂ جنگ بھی بدل گیا ہے۔
اب پیغمبر اسلامؐ اور تعلیماتِ اسلام پر جو کتابیں اور مضامین شائع کیے جا رہے ہیں، ان کا انداز
مناظرانہ نہیں، بلکہ محققانہ اور غیر جانبدارانہ اور نئی اصطلاح کے مطابق معروضی ہوتا ہے، مگر اس میں

دودھ کے گلاس میں زہر اس خوبی سے ملاتے ہیں کہ پینے والے کو احساس تک نہیں ہوتا اور اندر ہی
اندر ایمان ویقین کی آنتیں کاٹ دیتا ہے،
"معروضی مطالعۂ قرآن" کا مطلب جیسا کہ بتایا جاتا ہے، یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ صرف
ایک کتاب کی حیثیت سے کیا جائے، اور اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ کس کی ہے اور
اس کا مقصد کیا ہے۔ گویا شروع ہی میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کی نفی کر دی جائے۔ اور
ایمان کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیا جائے۔ حالانکہ قرآن کریم وہ صحیفۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی
طرف سے بندوں کی رہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اس سے استفاضہ کی شرط اول یہ ہے کہ
اس کے منزل من اللہ ہونے پر یقین ہو۔ دل میں اس کی پوری عظمت وحرمت ہو۔ اس سے
ہدایت طلبی کا جذبہ کامل ہو، پھر آئینۂ دل گناہوں کے زنگ سے پاک صاف ہو تاکہ اس میں
ہدایت ربانی کی کرنیں جلوہ گر ہو سکیں۔ یہ شرائط جس درجہ میں پائی جائیں گی اسی درجہ میں
ہدایت قرآنی سے استفادہ ہو سکے گا اور حکمت قرآنی کے خزانہ سے دامانِ طلب کو بھرا جا سکے گا۔
قرآن کریم میں شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ،
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، کہ یہ کتاب ایسی کتاب ہے۔ کہ جس کے منزل من اللہ ہونے میں، اور دین
ودنیا کی صلاح وفلاح کا سرچشمہ ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں یہ شمع ہدایت ہے۔
مگر ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ رکھتے ہیں تقویٰ نفس انسانی کی وہ کیفیت ہے جو اسے اللہ سے
ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے پر آمادہ کرے۔" ہدایت قرآنی کا حصول اسی پر موقوف ہے۔
اس کے بہت سے درجات ہیں۔ جس درجہ کا تقویٰ ہوگا اسی درجہ کی ہدایت حاصل ہو سکے گی۔
خوف خدا اور اللہ کی نافرمانی سے احتراز تو بعد کی بات ہے۔ جب ان کی بنیاد
ایمان باللہ ہی نہیں، تو خواہ قرآن کریم کے الفاظ کی تحقیق میں ہزاروں صفحات سیاہ

کردیئے جائیں اور قرآن کریم کی آیات کی ترتیب و تبویب میں جلدیں کی جلدیں تیار کردی جائیں پھر بھی ربانی اور حکمتِ قرآنی کی روشنی سے دل و دماغ منور نہ ہو سکیں گے۔

ان لوگوں کا حصہ قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت میں سے بھی بجز ضلالت و شقاوت و گمراہی و حیرانی کے کچھ نہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ

یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا وَمَا یُضِلُّ بِہٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ

اس قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور گمراہ فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔

حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما ویضع بہ آخرین۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلند کرتا ہے، اور کچھ کو گراتا ہے۔

بہرحال، ہمارے ان مستشرقین کے شوق و محنت کی آپ داد دے سکتے ہیں، انکے شاندار اداروں کی جہاں یہ بڑے بڑے وظیفے دیکر مسلمان طلبہ کا شکار کرتے ہیں، ان کی ضخیم اور خوبصورت کتابوں کی جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، آپ تعریف کر سکتے ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور قرآن کی حکمت کے انوار سے ان کے کارخانوں کو کیا تعلق، مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلائی جبلی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔ اس موقع پر مدارسِ اسلامیہ کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے فرمائی تھی، اور دوسرے اجلاس کی علامہ سید سلیمان ندوی نے کی، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کے ساتھ تھا۔ مولانا ابوبکر شیث ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے، حضرت مولانا ابوبکرؒ نے حضرت مولانا مدنیؒ کا

خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

"الفاظ قرآن و حدیث کی تحقیق میں، خواہ یورپ اور امریکہ کے دانشور کتابوں کے انبار لگا دیں مگر معانی و مطالب کتاب و سنت کی تحقیق کے لیے ہمیں آپ جیسے علمائے اعلام کے سامنے ہی زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔"

بہرحال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے۔ کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم و تحقیق کے سلسلہ میں، یورپ، امریکہ اور کینیڈا کے اسلامیات کے ادارے، کھوٹے سکوں کی ٹکسال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مگر ہماری انتہائی محرومی اور نادانی ہے کہ ہمارے ہندوستان کے اسلامی عصری تعلیمی اداروں میں وہاں کے ڈھلے ہوئے سکوں کو زر خالص سمجھ کر قبول کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں ہیں جن کا خصوصی تعلق مسلمانوں سے رہا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد۔ مسلم یونیورسٹی۔ تمام دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اور مسرت ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی اس حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے اینگلو محمڈن کالج کی حیثیت سے اس کی بنیاد ڈالی تو مقصد یہ قرار دیا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے شروع ہی میں شعبۂ دینیات قائم کیا جس میں مولانا عبداللہ انصاری، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث رحمہم اللہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے علماء راسخین شامل رہے۔

۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے محسوس کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی،

شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسنؒ نے انتہائی ضعف نقاہت میں اس کا افتتاح اس امید سے کیا کہ ملت اسلامیہ
کے جس درد وغم سے انکی ہڈیاں گھل رہی ہیں، یہ اس کا مداوا ہوگی"۔ اپنے استاد کی اسی آرزو کی تکمیل
کے لیے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے وہاں بیت الحکمۃ قائم کیا۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ
کے فلسفہ اسلام کا درس دیا۔جس میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین پابندی کے ساتھ شریک ہوتے
رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ "ان کی خواہش ہے کہ انگریزی اور اردو ادب
کے لیے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو سمویا گیا ہو۔ تاکہ طلبہ اسلامی
رنگ میں پوری طرح رنگے جاسکیں"۔

یہاں بھی علی گڑھ سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ شعبۂ دینیات قائم رہا جس میں مولینا
عبدالحیٔ فاروقی، مولانا محمد سورتی اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری جیسے فضلا، قرآن کریم، حدیث
شریف اور ادب عربی کا درس دیتے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو بھی اس حیثیت سے اسلامی یونیورسٹی کہا جاسکتا ہے۔ کہ یہ ایک مسلم
ریاست کے زیر سایہ قائم ہوئی۔ اس میں شروع ہی سے بڑے اہتمام سے شعبۂ دینیات قائم کیا گیا
جس میں مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے فضلا دنے علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی اور ڈاکٹر حمیداللہ
جیسے فاضل شاگرد پیدا ہوئے،

اب بھی مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات قائم ہے۔ ...... مگر اس کی حیثیت کو بہتر
بنانے کی ضرورت ہے باقی دونوں یونیورسٹیوں میں شعبۂ ..... دینیات کو ختم کر دیا گیا ہے اور
اس کے بجائے اسلامک اسٹیڈیز ڈیپارٹمنٹ قائم کر دیا گیا ہے۔

ان شعبوں میں عمل دخل زیادہ تر مستشرقین یورپ و امریکہ کے لائق شاگردوں کا ہے۔
نصاب تعلیم سے قرآن و حدیث کے متون کو خارج کرنے کے بعد صرف علوم اسلامی کی تاریخ

اور ان کی تنقید پر اکتفا کیا جارہا ہے۔[1] نصابی کتابیں زیادہ تر انہی مستشرقین کے نتائج افکار
ہیں۔ جن میں اسلام کو مغربی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور تحقیق و تنقید کے نام پر، مفسرین
و محدثین و فقہا و صوفیہ کے افکار و کردار کو مجروح و مشتبہ بنایا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ستون ہی
گرا دیے جائیں جن پر اسلام کی عظیم و رفیع عمارت قائم ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ واضح
ہے۔ جب اساتذۂ کرام کا یہ حال ہو تو غریب طلبہ کا علمی و عملی حیثیت سے جو حال ہو سکتا ہو
ظاہر ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا   کار طفلاں تمام خواہد شد

یہی صورت حال کم و بیش ہندوستان کے علاوہ پاکستان، مصر و شام وغیرہ میں بھی ہو سکتی
ہے۔ مگر وہاں کسی بھی وقت رائے عامہ کو منظم کر کے طاقت کے ذریعہ ان حالات کو بدلا جاسکتا ہے۔
مگر ہندوستان کے مسلمان ایسا نہیں کر سکتے تاہم وہ ایک ایسے ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے
جہاں ان کو اپنی تہذیب اپنا تمدن اور اپنے علوم کو باقی رکھنے کا، بلکہ ان کو پروان چڑھانے کا دستوری حق
دیا گیا ہے، اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں۔ اور اپنی ملی و دینی امیدگاہوں کو، جن کو ان کے بزرگوں نے خون جگر
سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

(۲)

مستشرقین اور تاریخ ترکی

از۔ ڈاکٹر اکمل ایوبی۔ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

"ترکوں کے خلاف مستشرقین نے جو علمی مہم چلائی ہے۔ اس مقالہ سے اس کا
اندازہ ہوگا۔ (معارف)

[1] مقالہ کے خاتمہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر مشیر الحق نے اس پر کافی روشنی ڈالی۔

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کو براہ راست مجروح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی دنیا کے اتحاد اور یک جہتی کو کمزور کرنے کے لیے بالواسطہ طریقوں سے بھی کام لیا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے ان ترکوں کو آلۂ کار بنانے کی کامیاب کوشش کی، جنھوں نے صدیوں تک اسلام کا جھنڈا بلند رکھا۔ خانہ کعبہ کے پاسبان بنے۔ اسلامی سطوت کا نشان رہے۔ اور شوکت اسلامی کے نقیب کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جہاں تک ترکوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے وہ ماضی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ چینی ماخذوں کی رو سے ترکوں کا وجود ۱۳۰۰ سنہ ق م تک ملتا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں ان کے مختلف قبیلے چین کی شمالی سرحد پر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی میں انکا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ مشرقی اور وسطی ایشیا ان کی تگ ودو کے میدان بن گئے۔ اسی صدی میں ترکوں نے ایک طاقتور سلطنت بھی قائم کرلی تھی۔ جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی لیکن ان کے مختلف قبائل وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر بھی حملے کرتے رہے۔ ان قبائل میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا۔ اور نہ ان کی کوئی مشترک زبان تھی۔ ترکی زبان کے ساتھ ہی ساتھ یورپی، ایرانی اور منگولی زبانیں بھی ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں۔ ان کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے سامانیت، بدھ مت اور عیسائیت کو اپنایا لیکن آخر میں انھوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں تبدیلی کی اور اپنے مخصوص قدیم رسم الخط کو تبدیل کر کے عربی رسم الخط اپنایا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان پر اسلامی تہذیب وتمدن کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جب خود ان کی حکومتیں ایشیا اور یورپ میں قائم ہوئیں تو یہ قوم اسلامی شوکت وطاقت کی علمبردار بن گئی۔ اور ان علاقوں میں اسلامی تمدن کے بیج ہی نہیں بوئے بلکہ ان علاقوں کو پوری طرح

اسلامی رنگ میں رنگ دیا جہاں مسلمان ہزار کوششوں کے باوجود اپنے قدم نہیں جما پائے تھے۔ اس وقت ترک کا نام ہی ہیبت پیدا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اور انھیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا، اسی ہیبت کی وجہ سے فتح قسطنطنیہ کے تقریباً دو سو سال کے بعد بھی ایک فرانسیسی مصنف Guillet نے ۱۶۸۱ء میں اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ہر عیسائی کو ہمیشہ یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ خدا پھر کوئی سلطان محمد ثانی نہ پیدا کرے جس نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے سلطان فاتح کا لقب پایا تھا۔ اس وقت ترکوں کے فتح وظفر کا سیلاب آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے اسٹریا کو تاخت وتاراج کر دیا اور اس طرح اگر ایک طرف "اندلس" مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا تو دوسری طرف اس زمانہ میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اسکی بخوبی تلافی کر دینے کے بعد ترک یعنی یورپ کا نیا دشمن ویانا کے دروازوں بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرۂ اسود کے شمالی سواحل تک پہنچ گیا، اور فتح مصر کے بعد ترکوں کے کلاہ تفاخر میں خادم الحرمین الشریفین کا طرۂ امتیاز بھی لگ گیا۔

ترکوں نے اپنی قومیت کی طرف سے ہمیشہ بیگانگی برتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان قوم تصور کرتے تھے۔ مستشرقین نے اسی رگ کو مضبوطی سے پکڑا اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگانے کی غرض سے ترکوں کو ان کی اس اصل قومیت کا احساس دلانے میں لگ گئے جس کا دار ومدار نسل اور مادری زبان پر ہے۔ اس کی تکمیل کی غرض سے ایک فرانسیسی مستشرق (Joseph De Guignes) نے آٹھویں صدی کے وسط میں ایک ذہنی خاکہ بنایا اور عملی شکل دینے کے لیے ترکوں کی قدیم تاریخ لکھی۔ اور ان کے ان کارناموں کو شاندار الفاظ میں پیش کیا جو ترکوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے انجام دئے تھے، اس مستشرق کی یہ کتاب علمی اور تحقیقی ضرور ہے لیکن اس نے قدیم غیر اسلامی ترکی تہذیب کے احیاء کی دعوت اس لیے دی کہ ترکوں کے اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا ہو۔ اس کا مقصد ترکوں کا تعلق غیر مسلم ترکوں سے قائم کرنا تھا، اور ان کو یہ بتانا

مقصود تھا۔ کہ وہ صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ ترک بھی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ ترک پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں اور ان کا غیر اسلامی دور بہت شاندار رہا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے جوسف وان ہمر، ڈیمیری راڈلوف اور جاہون نے اپنی تصانیف کے ذریعہ کوشش کی ہوورتھ، سر جیمس ولیم ریڈہاوس اور الیاس جون ولکنسن گب کی تصانیف بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اسی نقطہ نظر کو ارتھر لملی ڈیوڈس نے بھی اپنی کتاب A Grammar Of The Turkish Language لکھی جو ۱۸۳۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ یوں تو ڈیوڈس کی کتاب ترکی قواعد سے متعلق ہے۔ لیکن مصنف نے اس کتاب میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں ترکوں کی قدیم ترین تاریخ کو بہت نمایاں انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے کارناموں کو خود ترکوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترک ابھی تک . . . اپنی تاریخ آنحضرتؐ سے شروع کرتے تھے۔ اور خلفائے راشدینؓ بنو امیہ اور عباسی دور کو اپنی ہی تاریخ کے ابواب تصور کرتے تھے لیکن مستشرقین نے یہ کوشش کی کہ ترک اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستانیں سنکر خوش ہوں اور ان میں اس پر فخر کرنے کا شوق پیدا ہو۔ تاکہ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے ان میں نسلی تاثرات فروغ پا جائیں اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگے اور ترکوں کی قومیت کا دار و مدار مذہب کے بجائے ترکی نسل پر قائم ہو جائے۔ ان مستشرقین کا اصل مقصد ترکوں کے اسلامی ذہن کو بدلنا، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانا تھا۔ ان کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر ترکوں کا ایک حلقہ ان کا ہمنوا بن گیا۔ یہ حلقہ ان ہی مستشرقین کے زیر اثر برابر فروغ پاتا رہا۔ ان کے مستقل داعی پیدا ہوتے گئے۔ اور ان ہی کے ترک شاگردوں جیسے مصطفےٰ جلال الدین پاشا، احمد جودت پاشا، شمس الدین سامی، احمد مدحت، نجیب عاصم، بورصالی طاہر، احمد حلمی، سلیمان پاشا، محمد مراد، علی توفیق جیسے مصنفین ایک ذہنی انقلاب

برپا کرنے میں لگ گئے۔ اس انقلاب کا رخ ترکوں کے فلسفی ضیاء گوک آلپ نے باضابطہ ترکیت کی طرف موڑا جس کی وجہ سے ترکوں کا لگاؤ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے کسی حد تک کم ہوا اور مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنے اصلاحی کارناموں" کے ذریعہ سے ترکوں کا تعلق صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نہیں بلکہ ان کا رشتہ اسلامی دنیا سے بھی منقطع کرنے کی کوشش کی۔ مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ چنانچہ مغرب میں اتاترک کے ان کارناموں کا زور شور سے چرچا کیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں انقلاب برپا ہو گیا ہے اور ترکوں نے اپنا رشتہ اسلام سے بالکل منقطع کر لیا ہے۔ اس خیال کی اشاعت ٹوائن بی، کرک وڈ، ورتھم، ہنری ایلن، آرم اسٹرونگ، ہیری لیوک وغیرہ جیسے مصنفوں نے کی۔ ان نامور مصنفوں نے اتاترک کی سیاسی، اور قومی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بے دینی اور اس کی بے اعتدالی اور اس کی ناعاقبت اندیشی کو اس کا کارنامہ قرار دیا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ان مصنفوں نے مسلمان ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیکر علمی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ اور زہر آلود خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مستشرقین کو ترکوں سے سخت دشمنی تھی، ان کی تحریریں کینہ پروری سے پُر ہیں۔ ان کی بیشتر تحریروں میں تبلیغی مشن کی روح کارفرما ہے۔ مگر جب مصطفےٰ کمال ترک نے خود مستشرقین کے مقاصد کی تکمیل کر دی تو . . . اس کی شان میں قصیدے پڑھنا ان کا اخلاقی فرض بن گیا اور سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی تعریف کی ۔ اس کو سرفروش مجاہد، پُر جوش فدائی وطن و ملت، قابل ترین سیاست داں، قوم کا مصلح اعظم، ملک و ملت کی تعمیر کرنے والا معمار۔ عجائب روزگار، آزادی کا عاشق، مجاہد اعظم، شمع آزادی کا پروانہ، دل و دماغ اور روح تک کو آزاد کرانے والا انسان اور عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا گیا۔ ان ہی مستشرقین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ماخذ بھی ہیں،

اس لیے واقعات کی حقیقی نوعیت اور صحیح صورتِ حال پورے طور پر واضح نہ ہو سکی، اور نہ ہی عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے ہمارے سامنے آسکا۔ غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفےٰ کمال اتاترک سے ایک طرح کی خوش عقیدگی پائی گئی اور دینی حلقوں میں بھی اس پر تنقید گوارا نہیں کی گئی اور اس کے سیاسی اور قومی خدمات کی وجہ سے دین کے خلاف اسکے اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اس لیے اب اسکی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں ایسا بھی علمی اور تحقیقی کام ہو جس سے مصطفےٰ کمال اتاترک کی اصلاحات کے ساتھ ہی ساتھ اسلام سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے اور اس فرق کی بھی وضاحت ہو جائے جو حکومت کے مختصر محدود طبقے اور مسلمان ترک عوام کے درمیان پہلے بھی تھا۔ اور آج بھی موجود ہے۔

یورپی ممالک کو ترکوں سے سخت عداوت تھی۔ چنانچہ مغربی اہل قلم حضرات نے بھی ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیا ہے۔ اور ترکوں کے مذہب یعنی اسلام پر طعنہ زنی اور دیوانہ وار اعتراضات کئے ہیں۔ اس وقت ان کی تمام تصنیفات و تالیفات پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایورسلی نے اپنی کتاب دی ٹرکش امپائر میں عثمانی سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء۔ ۱۴۰۲ء) کے حالاتِ زندگی (ص ۴۸) لکھتے وقت ایک ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی آیت قرار دیکر اسلام کا دشمن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ امیر کرمانیہ علاء الدین مغربی ایشیا کے ترکوں کی سرداری کا خواہش مند تھا۔ اس لیے عثمانیوں سے اس کی عداوت تھی۔ وہ دولت عثمانیہ کو نقصان پہونچانے کی برابر کوشش کرتا رہا۔ اور متعدد بار عثمانی علاقوں پر حملے کئے جن میں سخت مقابلے بھی ہوئے۔ .... ایک مقابلہ میں

علاء الدین نے سلطان بایزید یلدرم کے سالار عسکر تیمور تاش کو گرفتار بھی کر لیا۔ یہ خبر سنکر یلدرم نے کرمانیوں پر حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر اپنے سالار عسکر کو آزاد ہی نہیں کرا لیا بلکہ علاء الدین اور اسکے دو لڑکوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ سلطان نے ان تینوں کو تیمور تاش کی حراست میں دیدیا۔ مگر اس نے بایزید یلدرم کی اجازت کے بغیر ہی تینوں کو پھانسی دیدی۔ یلدرم یہ سنکر بہت برہم ہوا اور رنجیدہ بھی مگر پھر ترکی کی کہاوت یا مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ "ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں ہے جتنا ایک صوبے کا نقصان۔" ہمارے مستشرق ایورسلی نے اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت کے بموجب یلدرم نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ یہ سفید جھوٹ قرآن کریم کی بے حرمتی اور اسلام سے دشمنی ہی کی وجہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایورسلی ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ مغربی ایشیا کے عیسائی ترکوں سے ڈر کر اسلام لائے تھے۔ اور ان کے اور ترکوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی۔ اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی۔ اس بیان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صرف مغربی ایشیا کے پرانے عیسائی یعنی نو مسلم اور مسلمان ترکوں کے درمیان شادیوں کے نتیجہ میں جو اولادیں ہوئیں وہ "عثمانی" کہلاتی تھیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو عثمانی سلطنت کا باشندہ تھا، عثمانی کہلاتا تھا اس میں نسل، مذہب اور زبان کی تفریق نہیں تھی۔ اسی طرح اچ۔ اے گبنز نے اپنی کتاب دی فونڈیشن آف دی اوٹومن امپائر میں یہ تحقیق کسی ثبوت کے بغیر پیش کی ہے کہ عثمانی سلطنت کا پہلا تاجدار یعنی سلطان عثمان اور اس کے تمام ساتھی بت پرست تھے۔ جو بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ اس مصنف نے عثمان کی فاتحانہ سرگرمیوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہے۔ کہ یہ سلاجقہ

قونیہ کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیلی مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہوگئیں، جب کہ اس سے قبل سغوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھے۔ اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "عثمانی اسلام سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں تبلیغی جوش ہے۔ یہ لوگ یونانیوں یعنی بازنطینیوں اور تاتاریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں"۔ مستشرقین نے سلطان عثمان کی ہمت، شجاعت اور اسکے عدل و انصاف کی خوب خوب تعریف کی ہے لیکن اس کے دامن پر خون کے دھبے بھی یہ کہکر لگا دینے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنے ایک بے گناہ بوڑھے چچا کو قتل کر دیا تھا، جب کہ اس کے شواہد نہیں ملتے ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ عثمانی ترکوں نے عیسائیوں کے نابالغ بچوں کو اسلامی تعلیمات دیکر اور ترکی زبان سکھا کر ایک ایسی زبردست فوج تیار کر لی تھی جس نے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت پیدا کر دی تھی۔ وہ فوج اپنی نوعیت کے اعتبار سے نئی تھی، اس لیے ینی چری یعنی نئی فوج کہلائی۔ اس "ینی چری" لفظ کی شکل یورپی زبانوں میں کافی بگڑ گئی ہے۔ فارسی اور ہماری مادری اردو زبان میں بھی غلطی سے "جان نثاری" ہو گیا ہے، بعض عربی کتابوں میں اسے "انکشاری" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف یہ بات قابل ذکر ہے کہ ینی چری کی بنیاد سلطان اورخان (۱۳۲۶ء – ۱۳۵۹ء) کے دور حکومت میں رکھی گئی تھی اور سب سے پہلے ایک ہزار نوجوانوں کی فوج بنائی گئی تھی۔ مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اورخان نے ان تمام نوجوانوں کو جمع کیا اور حاجی بکتاش ولی نامی صوفی بزرگ کے سامنے پیش کیا جنھوں نے اس نئی فوج کی کامیابی کی دعا دی۔ یہ واقعہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ حاجی بکتاش ولی نامی بزرگ سلطان عثمان کے دور میں تھے۔ اور تیرھویں صدی کے آخر میں ان کا

انتقال ہو گیا تھا۔ اور سلطان اورخان کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ میرے خیال سے "ینی چری" کو حاجی بکتاش ولی جیسے نامی صوفی سے منسوب کر دینے سے مستشرقین کا مقصد یہ ثابت کرنا رہا ہوگا کہ مسلمانوں کے صوفیوں نے بھی اسلام کو تلوار سے پھیلانے میں مدد دی ہے۔ اسی طرح مستشرقین نے سلطان عثمان کے جانشینوں کے محاسن کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ اور ان کی سنگدلی اور نقض عہد کے متعدد جھوٹے واقعات بیان کئے ہیں۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فتح کے روز جس رحمدلی اور زندہ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال اس کے کسی معصر نے پیش نہ کی۔ اس کے باوجود مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ان ہی مستشرقین نے سلطان محمد فاتح کو دل کھول کر برا بھلا کہا ہے اور اس کو بدکار اور نفس پرست تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں ڈیوک نوٹاراس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ "ڈیوک نوٹاراس نے اپنے لڑکوں کو سلطان محمد فاتح کی خلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا"۔ جب کہ یہ قتل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ جو ڈیوک نوٹاراس قسطنطنیہ کو ترکوں سے آزاد کرانے کے لیے اٹلی سے کر رہا تھا۔ اسی طرح سر جارج لارپنٹ نے اپنی کتاب ٹرکی میں اسلام سے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف تھا۔ اور عثمانی ترکوں کی نسبت یہ کہا ہے کہ یہ قوم منظم جہالت کی دلدادہ تھی۔ اسی طرح کے بہت سے بیانات مستشرقین نے اسلام اور مسلمان ترکوں سے متعلق اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔ اور حق اور سچائی کے بجائے تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا ہے، انھوں نے ترکوں کی تاریخ لکھنے میں جس تعصب کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اعتراف اب چند یوروپین اسکالرس بھی کرنے لگے ہیں۔ ابھی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کی جلد ۱۴، شمارہ ۱ (بابت جنوری ۱۹۸۲ء) میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لوئس کے ایک

اس مقالہ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ جس کا عنوان "اسلام" ہے۔ یہ مقالہ جس کا انگریزی سے اردو ترجمہ جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے کیا ہے۔ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ مگر بہت کم حضرات کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اس مقالہ میں برنارڈ لوئس نے خود اقرار کیا ہے کہ "یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق کتابیں زیادہ تر ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے"۔

اسی مقالے میں برنارڈ لوئس نے عثمانی ترکوں کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات میں، دوررس اثرات کے اعتبار سے، عثمانی ترکوں کی فتوحات کو بہت اہمیت حاصل ہے عثمانی ترکوں کے حملوں اور فتوحات کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، عثمانی فتوحات نے یورپ کے بڑے حصے کو یونان، بلقان، ہنگری اور پولینڈ تک اسلامی حکومت کے زیرنگیں کرلیا"۔ برنارڈ لوئس مزید لکھتے ہیں کہ "یورپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں ان ممالک میں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کرکے پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں خالصتاً مغربی شواہد پر مبنی ہیں۔ جو زیادہ تر ناقص گھڑی ہوئی اور غیر معتبر ہیں۔ ان کتابوں میں تاریخ یورپ میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے۔ برنارڈ لوئس کے اس بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ مستشرقین کی "معتبر" کتابیں کتنی غیر معتبر ہیں، اس لیے اب مسلمان اہل قلم حضرات کو خود اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ نہ صرف اپنی مادری زبان میں بلکہ یوروپین زبانوں میں بھی لکھنی چاہیئے۔ تاکہ مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو رد کیا جاسکے اور مستند و صحت مند معلومات اور نقطۂ نظر اصل ماخذ کی بنیاد پر پیش کیا جاسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شعر و سخن کی قدردانی

از عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دارالمصنفین

(۲)

اوپر جو مثالیں گذری ہیں، ان سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ اشعار سن کر تبسم فرماتے تھے، اور کبھی کبھی ان پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار بھی فرماتے تھے، بعض اشعار کی آپ سے تعریف و تحسین بھی منقول ہے، ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے شاعر کے لئے دعائے خیر فرمائی ہے، آگے ہم جو مثالیں نقل کریں گے، ان سے ظاہر ہوگا کہ آپ نے لوگوں کو شعر گوئی کی جانب ترغیب و تشویق بھی دلائی ہے، اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی امر و تلقین بھی فرمائی ہے۔

امر و ترغیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر لوگوں کو شعر و سخن کی تلقین و ترغیب بھی کی ہے، مشرکین اپنے اشعار میں جب مسلمانوں کی ہجو کرتے، اور ان کے خلاف غلط بیانی سے کام لیتے، تو آپ مسلمان شعراء کو ان کا جواب دینے کا حکم دیتے، ابن جریر نے حضرت جابرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من یحمی اعراض المسلمین؟[1] — مسلمانوں کی عزت و آبرو کی طرف سے کون دفاع کرے گا۔

---

[1] دلائل الاعجاز (حاشیہ رشید رضا) ص ۱۳،

مشرکین مکہ چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جواب دیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت، کعب بن مالک، اور عبد اللہ بن رواحہ کا انتخاب کیا، تاکہ ان کی نخوت پر ضرب لگے۔[1]

اوپر آپ کا یہ ارشاد گذر چکا ہے کہ انبیاء تلواروں کے مقابلہ میں زبان سے نصرت وحمایت کے زیادہ مستحق ہیں۔[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ قریش کی ہجو کرو، کہ یہ ان کے لئے تیر [illegible] کہیں زیادہ کارگر ہوگی،[3] امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل کفر شہریت قبول کرنے یا کسی معاہدہ کے ذریعہ امان حاصل کرنے کے باوجود اگر ہجو اور اذیت رسانی سے باز نہ آئیں، تو مسلمانوں کے لئے ان سے نپٹنے کے اور طریقے بھی ہیں، لیکن اگر انہیں امان نہ دی گئی ہو تو ان کے خلاف ادبی محاذ کھول دینے، اذیت رسانی اور ہجو کا جواب دینے کی اجازت ہوگی، ان کی خامیوں کے بیان کرنے اور ان پر غالب رہنے کے لئے ایسے موقعوں پر توجہاد اور سخت گیری کا بھی حکم دیا گیا ہے، البتہ ان چیزوں کا مسلمانوں کی طرف سے آغاز نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ خدا کے سوا اوروں کو پکارتے اور پوجتے ہیں، انہیں برا نہ کہو، ورنہ وہ بھی خدا کو ناواقفیت کی بنا پر برا بھلا کہنے لگیں گے"۔[4]

حسان بن ثابت دور جاہلیت میں بھی مدینہ کے سب سے بڑے شاعر تھے، اور دور اسلام میں بھی اس حیثیت سے ممتاز تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں مقابلہ اور مبارزت کے وقت اس طرح کے احکام دیا کرتے تھے،

أهج قريشا فان الهجاء اشد عليهم من رشق النبل۔[5] — قریش کی شان میں ہجو یہ اشعار کہو، کیونکہ اس کا اثر ان پر تیروں سے بھی زیادہ ہوگا۔

أهج المشركين فان روح القدس معك[6] — مشرکوں کی ہجو کرو، بلاشبہ جبریل تمہارے ساتھ ہیں

۱ دلائل الاعجاز ص۱۲ و حاشیہ، ۲ مصنف عبد الرزاق ج ۱۱ ص ۲۶۳، ۳ مسلم، ۴ المرقاۃ، وحاجۃ المصابیح ج ۴ ص ۵۴، ۵ مسلم ۶ ترمذی۔

أهجهم فان روح القدس سيعينك[1] — ان کی ہجو کرو، روح القدس تمہاری مدد کریں گے،

يا حسان أهجهم و جبريل معك[2] — اے حسان! ان کی مذمت میں اشعار کہو اور جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔

يا حسان أجب عني، اللهم ايده بروح القدس[3] — حسان! میری طرف سے جواب دو، اے اللہ! انہیں روح القدس کے ذریعہ قوت عطا فرما۔

اس قسم کے اشعار میں خیالات کی پاکیزگی اور اسلوب کی دلکشی کے ساتھ فحش گوئی اور ہرزہ سرائی کے جواب میں اسلام کے محاسن اور حکمت و خیر کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، کذب بیانی اور غلو کے جواب میں حقیقت پسندی اور سادگی دکھائی گئی ہے، اور مشرکین مکہ کی ذات سے تعرض کئے بغیر ان کی فکری کم مائیگی اور گمراہی واضح کی گئی ہے،

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بہادری اور جاں نثاری کی حوصلہ افزائی کے لئے آپ نے حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ ان کے بارے میں مدحیہ اشعار کہیں، صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے بھی طلحہ کی مدح میں اشعار کہے تھے،[4] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سعادت میں جبکہ حریف طاقتوں نے سخت معرکے برپا کر رکھے تھے، ایسی صورت میں شعر و سخن کے ذریعہ بھی جہاد اور جنگ ناگزیر تھی۔

ایک قبیلہ کا وفد مبارزت طلبی کے لئے آیا، ثابت بن قیس نے ان کے خطیب عطارد کا، اور حسان بن ثابت نے انکے شاعر زبرقان بن بدر کا جواب دیا، آخر میں اس وفد کے ایک رکن اقرع بن حابس نے کہا:

وأبي ان هذا الرجل لمؤتى له لخطيبه اخطب من خطيبنا و — میرے باپ کی قسم یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) باتوفیق ہے، ان کا خطیب

۱ بخاری و مسلم ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ منتخب الکنز ج ۵ ص ۶۸۔

شاعرہ اشعر من شاعرنا[1] — ہمارے خطیب سے بڑا، اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بڑا ہے:

بعض اشعار پر رسول اللہؐ کے تحسین آمیز کلمات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شعروں پر تحسین و آفریں کے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں، ان کی بعض مثالیں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، ذیل میں انکی مزید کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ایک قصیدہ کا آخری شعر تھا:

فثبت اللہ ما آتاک من حسن — تثبیت موسی ونصرا کالذی نصروا

ترجمہ: اللہ نے جو خوبیاں عطا کی ہیں، ان کی بنا پر آپ کو ثابت قدم رکھے اور مدد فرمائے، جس طرح کہ موسیٰؑ کو ثابت قدم رکھا، اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی۔

اسے سن کر ارشاد فرمایا:

وانت فثبتک اللہ یا ابن رواحہ[2] — اے ابن رواحہ! تم کو بھی خدا ثابت قدم رکھے!

ان ہی کے بارے میں ایک موقع پر فرمایا:

ان اخا لکم لا یقول الرفث[3] — تمہارے بھائی نے بری بات نہیں کہی،

کعب رضی اللہ عنہ بن مالک کے ایک قصیدہ پر فرمایا:

لقد شکر اللہ علی قولک ھذا یا کعب[4] — اے کعب تمہارے اس قول کی خدانے قدردانی فرمائی ہے۔

انھوں نے ایک بار قریش پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر کہا:

جاءت سخینۃ کی تغالب ربھا — ولیغلبن مغالب الغلاب

---

[1] الاستیعاب لابن عبدالبر ص۱۹۶، اور کچھ فرق کے ساتھ زاد المعاد ج۳ ص۲۰۳، [2] طبرانی کبیر - جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۹، [3] البخاری - جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۷، [4] الروض الانف ج۲ ص۹۲۔

سخینۃ ایک مخصوص کھانا ہے، جو قریش کو پسند تھا، یہاں بطور تعریض کے قریش کے لئے سخینہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، شعر کا ترجمہ یہ ہے:

"قریش نے چاہا کہ اپنے رب پر غالب ہو جائیں، حالانکہ یہ زبردست لوگ یقیناً مغلوب ہوں گے"

شعر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لقد مدحک اللہ یا کعب فی قولک ھذا[1] — اے کعب تمہارے اس قول کی تو خدانے بھی تعریف کی ہے۔

کعب رضی اللہ عنہ بن مالک ہی کے بارے میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

انک محسن الشعر[2] — تم اچھا شعر کہہ لیتے ہو۔

حسان رضی اللہ عنہ بن ثابت کے بارے میں فرمایا:

ھجاھم حسان فشفی واشتفی[3] — حسان نے ان کی ہجو کر کے ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے، اور اپنے دل کا غبار بھی نکال لیا۔

انہی کے بارے میں ایک مرتبہ فرمایا:

حسان حجاز بین المومنین والمنافقین لا یحبہ منافق ولا یبغضہ مومن[4] — حسان اہل ایمان اور منافقوں کے درمیان ایک دیوار ہیں، نہ منافق کو ان سے محبت ہوگی اور نہ ہی مومن کو ان سے نفرت۔

کعب رضی اللہ عنہ بن زہیر نے جب اپنا قصیدہ بانت سعاد پڑھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ

---

[1] قرطبی ج۱۳ ص۱۵۳، وابن عساکر عن جابر، [2] ابن جریر عن جابر۔ دلائل الاعجاز (حاشیہ رشید رضا مرحوم) ص۱۲، [3] بخاری و مسلم - جمع الفوائد ج۲ ص۱۶۷، [4] ابن عساکر۔

کہ ان کی پچھلی باغیانہ روش پر معافی دی، بلکہ بطور انعام اپنی روائے مبارک بھی انہیں عطا فرمائی۔[۱]

آپؐ نے علاء بن حصین کے اشعار کو حکمت[۲]، اور لبید کے شعر کو صداقت شعار[۳] قرار دیا۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ پاکیزہ اور اچھے اشعار کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی[۴]۔

کیا شاعری عیب ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً شاعر نہ تھے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ	ہم نے آپ کو شعر گوئی نہیں سکھائی، اور
(یٰسٓ:)	یہ آپ کے لئے مناسب بھی نہ تھی۔

لیکن اس آیت کو شعر کی مذمت کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ قرآن مجید میں آپ کے بارہ میں یہ بھی کہا گیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ	اور آپ اس سے قبل نہ کوئی کتاب پڑھتے
وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ	تھے، اور نہ ہی اسے اپنے دست مبارک
	سے لکھتے تھے۔

اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ دوسروں کے لئے بھی پڑھنا لکھنا معیوب ہے، بلکہ دراصل ان آیتوں میں قرآن اور رسالت کے ان منکرین کو جواب دیا گیا ہے، جو یہ کہتے تھے کہ آپؐ شاعر ہیں، اور آپ نے اپنے جی سے گڑھ کر قرآن کو پیش کیا ہے[۵]۔

آیت بالا "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ" سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ شاعر تھے، اور نہ آپ کو شعر کے اوزان، اس کی بحروں اور قوافی وغیرہ کے بارے میں واقفیت تھی[۶]۔ علاوہ ازیں آیت قرآنی میں آپ کی شعر گوئی کی نفی کی گئی ہے، نہ کہ شعر پڑھنے کی، احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ اپنی

---

[۱] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۳، العمدہ ج ۱ ص ۷، الأغانی ج ۳ ص ۱۲۱۳ [۲] العمدہ ج ۱ ص ۱۷، [۳] بخاری، جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷، [۴] تفسیر القرطبی ج ۱۵ ص ۵۴، [۵] ایضاً ج ۱۵ ص ۵۳۔

زبان مبارک سے دوسروں کے اشعار پڑھتے تھے، اور دو ایک بار آپؐ نے انہیں موزوں بھی پڑھا تھا، مگر بالعموم موزوں طریقہ پر نہ پڑھتے تھے،[۱] لیکن اس کی یہ وجہ ہرگز نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادبی ذوق میں کوئی کمی یا خامی تھی، بلکہ زبان و ادب سے واقفیت اور فصاحت و بلاغت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیاز و کمال کا تو سب ہی کو اعتراف تھا، جیسا کہ مضمون کی ابتداء میں ذکر کیا جا چکا ہے،

علامہ قرطبی آپ کے شعر کو موزوں نہ پڑھنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں:

"نبوت کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی تھی، کہ جن لوگوں کی طرف آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ اس شبہ میں نہ پڑیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن جیسا کلام صرف اس بنا پر پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، کہ آپ نے موزوں طبیعت پائی تھی، اور آپؐ میں شعری سلیقہ موجود تھا۔"[۲]

عربی زبان و ادب میں سب سے بلند تر اور فائق ہونے کے باوجود آپ کا کبھی کبھی غیر موزوں طریقہ پر کسی شعر کو پڑھ دینا، یا موزوں بحروں کے خلاف پڑھ جانا غیبی تربیت، تائید ایزدی اور شان نبوت کی عظمت کا ایک ثبوت تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ:

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچ مچ اسی طرح ہیں، جس طرح کہ خدا نے فرمایا ہے کہ "اس نے آپؐ کو شعر کا علم نہیں دیا، یہ آپ کے شایان شان نہ تھا۔"[۳]

غرض زندگی کے ہر شعبہ کی طرح، شعر و سخن کے میدان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کو رہنمائی دینی مقصود تھی، اسی لئے مختلف موقعوں پر آپ نے دوسروں کے اشعار اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شعر و سخن میں کوئی قباحت اور عیب نہیں،

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج ۲۳ ص ۴۱، [۲] تفسیر القرطبی ج ۱۵ ص ۵۵ [۳] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲، قرطبی ج ۱۵ ص ۵۵۔

دوسروں کے اشعار زبانِ نبوت پر

ذیل میں وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں، جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، آپ کبھی ایک ہی مصرع اور کبھی پورا شعر پڑھتے تھے، مثلاً:

(۱) ع ویاتیک من لم تزود بالاخبار

پورا شعر یوں ہے:

ستبدی لک الایام ماکنت جاهلا　　ویاتیک بالاخبار من لم تزود

ترجمہ: "زمانہ جلد ہی تجھ کو ان باتوں کی خبر دے دیگا جن سے تو ناواقف تھا، اور تیرے پاس ایسا شخص خبریں لارہا ہے، جس کو تو نے کوئی معاوضہ نہیں دیا"۔

سبعہ معلقہ میں مشہور جاہلی شاعر طرفۃ العبد کی طرف یہ شعر منسوب ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی کی روایت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔[1]

(۲) تفاءل بما تهوى يكن فلقلما　　يقال لشئ كان الا تحققا

ترجمہ: "جب تم کوئی نیک شگون لیتے ہو تو وہ ہو جاتا ہے، اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اِدھر بات زبان پر آئی اور اُدھر وہ ہو گئی"۔

حضرت عائشہ رضی کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مصرع پڑھے، البتہ آخری لفظ صرف تحقق زبان مبارک سے ادا ہوا۔[2]

(۳) اتجعل نهبي ونهب العبيد　　بين عيينة والاقرع

ترجمہ: "کیا آپ میری اور غلاموں کی جنگ کا حاصل، عیینہ اور اقرع کے درمیان بانٹ دیں گے"

آپ کی زبان مبارک پر "بین الاقرع وعیینة" تھا، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی نے فرمایا:

اشهد انك كما قال الله وما　　میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اسی طرح ہیں

---

[1] ترمذی، جمع الفوائد ج ۲ ص ۱۶۷، [2] ابن کثیر ج ۸ ص ۲۳۵ (علی حاشیۃ فتح البیان)

عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ[1]　　جیسا کہ خدا نے فرمایا" اور ہم نے آپ کو شعر کا علم نہیں دیا، یہ آپ کے شایان شان بھی نہ تھا

(۴) هريرة ودع ان تجهزت غاديا　　كفى الشيب والاسلام للمرء ناهيا

ترجمہ: "اے ہریرہ! اگر تو نے سامان سفر تیار کر لیا ہے تو صبح کو روانہ ہو جا۔ بڑھاپے کی سپیدی اور اسلام دونوں ہی اظہار محبت سے مانع ہیں"۔

یہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر "کفی بالاسلام والشیب للمرء ناهیا" آیا تھا، اور حضرت صدیق اکبر رض نے (اور ایک روایت کے مطابق حضرت عمر فاروق رض نے) وہی بات فرمائی، جو اوپر گزر چکی ہے۔[2]

(۵) غزوۂ احد میں انگشت مبارک زخمی ہوئی، تو آپ نے یہ شعر پڑھا:

هل انت الا اصبع دميت　　وفي سبيل الله مالقيت

ترجمہ: "ایک انگلی کی اوقات کیا جو خون آلود ہو گئی، اور راہ خدا میں زخم سے دوچار ہوئی"۔

ابن ہشام نے اس شعر کو ولید بن مغیرہ کی طرف، اور ابن جوزی نے عبداللہ بن رواحہ رض کی طرف منسوب کیا ہے، اور ایک روایت کے مطابق یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے۔[3]

(۶) يبيت يجافي جنبه عن فراشه　　اذا استثقلت بالمشركين المضاجع

ترجمہ: "وہ اپنا پہلو بچھونے سے الگ رکھتے ہیں، جب کہ مشرکین سے ان کے بستر بوجھل رہتے ہیں"۔

یہ عبداللہ بن رواحہ رض کا شعر ہے، جسے امام قرطبی کی تصریح کے مطابق آپ نے موزوں طریقہ پر پڑھا تھا، اور علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ یہ اور اس سے پہلے کا شعر "هل انت الا اصبع" دونوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۲۲، قرطبی ج ۱۵ ص ۵۱، [2] قرطبی ج ۱۵ ص ۵۲، ۵۳ [3] روح المعانی ج ۲۳ ص ۴۸

نے موزوں طور پر ادا فرمایا تھا۔[۱]

(۷) غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مٹی ڈھونے میں شریک تھے، جس کی وجہ سے شکم مبارک گرد آلود ہوگیا تھا، اس وقت آپ بار بار یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے:

والله لولا الله ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا

فانزلن سكينة علينا وثبت الاقدام ان لاقينا

ان الأولى قد بغوا علينا إذا ارادوا فتنة أبينا

راوی کہتے ہیں کہ آخری مصرع میں لفظ أبینا کو، آپ زیادہ بلند آواز میں بار بار دہراتے اور أبینا أبینا فرماتے۔[۲]

امام بخاریؒ نے کتاب المغازی میں یہ بھی نقل کیا ہے، کہ یہ اشعار عبد اللہ بن رواحہ کے ہیں، انکا ترجمہ یہ ہے:

۱۔ اللہ کی توفیق نہ ہوتی تو بخدا ہم راہ یاب نہ ہوتے۔ نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔

۲۔ اس لئے اے اللہ ہم پر سکون نازل فرما، اور جب ہم دشمن سے مقابلہ کریں تو ہمیں ثابت قدم رکھ،

۳۔ انھوں نے ہم پر زیادتی کی ہے، جب انھوں نے فتنہ و فساد کا ارادہ کیا، تو ہم نے انکار کر دیا۔

ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں کہ "ان الأولى قد بغوا علینا" موزوں اس وقت ہوگا، جب یوں پڑھا جائے "ان الذین قد بغوا علینا" اور ابن التین کے خیال میں اس کی موزوں صورت یہ ہے "ان الاولی هم الذین قد بغوا علینا"[۳]

(۸) ع "ألا كل شيء ما خلا الله باطل"

---

۱ روح المعانی ج ۲۳ ص ۴۵، ۲ بخاری و مسلم۔ فتح الباری ج ۶ ص ۳۴، ۳ فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۶،

لبید بن ربیعہ کا مصرع ہے، جو زبان رسول ﷺ سے ادا ہوا، پورا شعر یوں ہے:

ألا كل شيء ما خلا الله باطل وكل نعيم لا محالة زائل

ترجمہ: "آگاہ رہو کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے، اور ہر نعمت یقیناً زائل ہونے والی ہے"

(۹) آپ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے، تو آپ نے امرؤ القیس کا یہ شعر پڑھا:

الم ترياني كلما جئت طارقا وجدت بها طيبا وان لم تطيب[۱]

ترجمہ: "کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں جب جب وہاں پہنچا تو میں نے خوشبو محسوس کی، حالانکہ اس نے خوشبو کے لئے کوئی ظاہری سامان نہ کیا تھا"

(۱۰) ع "اتيناكم اتيناكم فحيانا وحياكم"[۲]

مدینہ طیبہ کے کسی غیر معروف شاعر کا مصرع ہے، پورا شعر اس طرح ہے:

اتيناكم اتيناكم فحيانا وحياكم ولولا الحنطة السمراء لم نحلل بواديكم

ترجمہ: "ہم تمھارے پاس آئے، پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں، اور اگر رنگ دار گیہوں نہ ہوتا تو ہم تمھارے علاقہ میں نہ آتے"

ایک اور روایت میں فحیونا نحییکم (پس ہم کو سلامت رکھو ہم تمھیں سلامت رکھیں) کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں۔[۳]

(۱۱) ایک بار آپ نے یہ شعر پڑھا:

ان تغفر اللهم تغفر جما واى عبد لك لا الما[۴]

ترجمہ: اے اللہ اگر آپ معافی دیں تو سارے ہی گناہوں کو معاف فرمائیں، آپ کا ایسا کون بندہ

---

۱ قرطبی ج ۵ ص ۵۱، ۲ مشکوٰۃ باب اعلان النکاح، ۳ مسند احمد بن حنبل، ابن ماجہ کتاب النکاح، نیز دیکھئے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ۔ ۴ ترمذی تفسیر سورۃ والنجم ص ۵۲۳

ہے جس نے غلطی نہ کی ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آیا، آپ نے ان سے دعوت مباہلہ دی، ابوالفرج اصبہانی کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا شعر کو اس وقت نجرانی وفد کے ایک نمایندہ، یزید بن المدان نے پڑھا تھا،[1] محمد بن سلام جمحی اور ابن کثیر کا بیان ہے کہ امیہ بن ابی الصلت یہ شعر پڑھا کرتا تھا،[2]

(۱۲) مسجد نبوی کی تعمیر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ ساتھ خود بھی اینٹیں اٹھاتے تھے، اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے؛

هذا الحمال لا حمال خيبر | هذا ابر ربنا واطهر

ترجمہ: "یہ خیبر (میں یہودی ساہوکاروں کے یہاں مزدوروں) کی جیسی باربرداری نہیں، یہ، اے ہمارے رب: اس سے زیادہ مخلصانہ اور پاکیزہ تر ہے"

امام بخاریؒ نے ابن شہاب زہریؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شعر ایک مسلمان شاعر کا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمایا،[3]

(۱۳) ليس من مات فاستراح بميت | انما الميت ميت الاحياء[4]

ترجمہ: "جو مر کر راحت ابدی پاگیا وہ مردہ نہیں ہے، مردہ تو وہ ہے جو جیتے جی (قلب و روح کے لحاظ سے) مردہ ہو گیا ہو"

یہ عدی بن رعلاء غسانی کا شعر ہے۔[5]

(باقی)

---

[1] الأغانی ج ۳ ص ۱۳۰، [2] دیکھئے طبقات فحول الشعراء ص ۱۰۵، اور البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۲۵
[3] البدایۃ والنہایۃ ج ۳ ص ۱۹۶، [4] مسند فردوس للدیلمی، کنوز الحقائق ج ۲ ص ۷، [5] الاصمعیات ص ۱۶۱، تاج العروس ج ۱۲ ص ۵۸۶

ایک بین الاقوامی سمینار کے سلسلہ میں

لندن کی ڈائری

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

سفر کی تیاری مسلم انسٹیٹیوٹ لندن سے مئی ۱۹۸۳ء میں ایک دعوت نامہ موصول ہوا کہ اگست کے شروع میں ایک سمینار "اسلام میں ریاست اور سیاست" کے عنوان سے ہونے والا ہے، اس میں شرکت کریں، اس کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب ہیں، جو دار المصنفین سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس ادارہ پر ان کے کچھ احسانات بھی ہیں، ان کی اس دعوت کو خوشی سے قبول کیا اور خیال ہوا کہ اسی بہانہ دیار فرنگ کی بھی سیر ہو جائے گی، مقالہ محنت سے لکھا جو خالص تحقیقی اور تاریخی رنگ میں تھا، جب لندن سے آنے جانے کے ٹکٹ بھی آگئے تو ۲۰ر جولائی کو اعظم گڈھ سے روانہ ہوا، مولوی ابوالبقاء ندوی کو دار المصنفین کے مطبع کے لئے دہلی میں ایک مشین کی خریداری کرنی تھی، اس لئے وہ دہلی تک سفر میں ساتھ ہو گئے، لکھنؤ دو روز رکا، وہاں اردو اکادمی کے ایک جلسہ میں شرکت کر کے ۲۳ر جولائی کو دہلی روانہ ہوا، فرسٹ کلاس اے. سی. میں جگہ ملی، یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس میں ویسی ہی بھیڑ بھاڑ تھی، جیسی اور ڈبوں میں رہتی ہے، جو برتھ ہم دونوں کو ملے وہ فرسٹ کلاس کے ڈبوں سے زیادہ آرام دہ نہ تھے، نسبتاً ٹھنڈے تھے، دہلی میں بہت سارے کام انجام دینے تھے، اس لئے وسط شہر میں رہنے کے خیال سے مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند کے ساتھ ان کے دفتر کے مہمان خانہ میں ٹھہرا، جو اب بہت عمدہ بنا لیا گیا ہے، یہ بیرون ممالک کے مہمانوں

کے لئے ہے لیکن مولانا ابو اللیث نے اپنے دیرینہ اور خصوصی تعلقات کی بنا پر اسی میں ہم لوگوں کو ٹھہرایا جس کیلئے ہم لوگ ان کے ممنون ہوئے۔ خیال تھا کہ لندن سے حج یا عمرہ کی اجازت مل جائے گی تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر ہندوستان کی واپسی ہوگی، مگر سعودی سفارت خانہ سے اس کی اجازت نہیں ملی حالانکہ مولوی ابو البقار نے ہر قسم کی دوڑ دھوپ کی، میرے گھر کی عورتیں پاکستان جانے والی تھیں، اس کے سفارت خانہ سے ویزا لینے میں بڑی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ویزا لینے والوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے، مولوی ابو البقار کی کوششوں سے یہ ویزا مل گئے۔

لندن میں داخلہ کا پرمٹ لینے کے لئے برطانوی سفارت خانہ گیا، وہاں پرمٹ حاصل کرنے کے لئے کافی لوگ تھے، مگر ہر کام سلیقہ سے جلد طے پا گیا، مجھ سے طرح طرح کے سوالات ضرور کئے گئے مگر پرمٹ کی مہر پاسپورٹ پر آسانی سے لگا دی گئی، گو کامن ویلتھ کے شہریوں کے لئے یہ پرمٹ لندن کے ایرپورٹ پر بھی کسی مشکل کے بغیر مل جاتا ہے، ہوائی جہاز کا میرا ٹکٹ پین امریکن سے تھا اس کے دفتر میں سفر کی تصدیق کرائی، وہاں سے برادرم شہاب الدین دسنوی کے یہاں ہمدرد نگر چلا گیا، جہاں جناب اوصاف علی صاحب ڈائرکٹر انڈین اسلامک اسٹڈیز انسٹیٹیوٹ سے بھی ملاقات ہوئی جو عزیزانہ طور پر ملے۔

ہوائی جہاز کا سفر | ۳۱ر جولائی کو تین بجے رات سے پہلے پالم ہوائی اڈہ پہونچنا ذرا مشکل کام تھا لیکن مولوی ابو البقار کی مستعدی کی وجہ سے یہ کام آسان ہو گیا، بھوپال سے برادر عزیز مولانا عمران خان ندوی کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر محمد حسان خاں بھی دہلی پہونچ گئے تھے پھر میرا چھوٹا لڑکا شاکر الرحمٰن علی گڈھ سے اپنے ایک دوست محمد ندیم کے ساتھ رخصت کرنے آ گیا تھا، پھر یکایک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ناظم دینیات مولانا محمد تقی امینی جماعت اسلامی کے دفتر میں تشریف لائے اور یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ بھی لندن کے سیمینار کے لئے شریک سفر ہوں گے۔

گیارہ بجے رات کو ہم لوگ ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہوئے، مولانا محمد تقی امینی کی وجہ سے سفر میں

تنہائی کا خیال جاتا رہا، وہاں سیمینار میں شرکت کے لئے اسلامک اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری فخر الاسلام بھی آ گئے، ان سے سفر میں بڑا آرام ملا۔

ہوائی جہاز پر ہم لوگ ساڑھے تین بجے رات کو سوار ہوئے، دو گھنٹے میں کراچی پہونچے خیال تھا کہ یہاں اترنے کی اجازت ملے گی تو اپنے داماد ڈاکٹر راشد مصطفٰے سے ٹیلیفون پر ان سے گفتگو کرونگا مگر اترنے کی اجازت نہ تھی، فجر کی نماز ہوائی جہاز ہی کے فرش پر کسی نہ کسی طرح پڑھ لی، وہاں سے چل کر ہوائی جہاز فرینک فرٹ پر رکا، اس کا ہوائی اڈہ اس طرح بنا ہوا ہے کہ اترنے کے لئے کوئی زینہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں سے باہر اس طرح چلے گئے جیسے ہوائی جہاز ہی میں ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں منتقل ہو گئے، اس کا ہوائی اڈہ ایسا شاندار تھا کہ ہمارا ملک دہلی میں ایسا اڈہ شاید مدت مدید کے بعد ہی بنا سکے، یہاں پورا ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا، جہاں جگمگاتی اور خلعت دوکانوں میں ہر قسم کی چیزیں فروخت کے لئے موجود تھیں، یہاں سے جو مسافر ہمارے جہاز کے لئے آئے، ان کے بیگ وغیرہ کو چیک کرنے کے لئے ہمارے ہوائی اڈوں کے افسروں کی طرح کھولنے کی ضرورت نہ تھی، ان کے پاس ایک ایسی مشین تھی جس سے بیگ کو سامنے رکھ کر اس کے اندر کی ساری چیزوں کی تصویریں ان کی مشین میں آ جاتیں، پھر چند لمحوں میں چیکنگ ختم ہو جاتی۔

ہوائی جہاز میں آنکھوں کو تکلیف ہمراہ امریکی اور فرنگی عورتوں پر نظر پڑنے سے ہوتی رہی تو وہ عورتوں کیجائے زن مذکر بلکہ خواجہ سرا دکھائی دیتی رہیں، خواجہ سراؤں کے یہاں بھی ستر پوشی کا لحاظ رہتا ہے مگر ان کے یہاں ستر کوئی چیز نہیں، کھانا آیا تو اس میں مرغ کا گوشت تھا، خیال آیا کہ شاید غیر ذبیحہ ہو اسلئے وی۔ جی ٹیرین کھانا مانگا، جو مشکل سے کھایا گیا، معلوم ہوا کہ مسلم حلال میل کا بھی اب اہتمام ہونے لگا ہے، چودہ گھنٹے میں لندن پہونچے، میں اپنی جگہ پر اونگھتا رہا، سونے کی گنجائش نہ تھی، فجر کی نماز کراچی میں پڑھ لی تھی مگر ہوائی جہاز پر بارہ گھنٹے رہنے کے باوجود ظہر کی نماز کا وقت ہی نہیں آیا، ہم لوگ ساڑھے بارہ بجے دن کو

لندن کے ہوائی اڈے پر پہونچے، بکثرت مسافر اترے، مگر وہ انتہائی سلیقے سے چیکنگ کاؤنٹر تک پہونچے جہاں
مشکل سے پانچ منٹ ٹھہرنے کی ضرورت ہوئی، پاسپورٹ دیکھا، چھ مہینے کے قیام کی مہر لگادی، حالانکہ
اتنے دنوں تک ٹھہرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی، پھر بتادیا کہ سامان کہاں ملیگا، وہاں پہونچے تو ہم لوگوں
کا سارا سامان محفوظ رکھا تھا، اس کے پورے ہوائی اڈے کو تو دیکھنے کا موقع نہیں ملا، مگر بہت بڑا
نظر آیا، ہم لوگ اپنے ہوائی جہاز سے اتر کر ایک گیلری میں کھڑے ہوئے تو اس کا راستہ متحرک ہوگیا،
اور ہم لوگ کاؤنٹر کے پاس پہونچا دیئے گئے، ایک ٹرولی میں اپنا سامان رکھ کر باہر آئے، تو عزیزی ڈاکٹر
محمد فاتح اپنے لڑکے محمد علی کے ساتھ موجود تھے، وہ وہاں گیارہ سال سے ہیں، ان کی پرورش اپنے
لڑکے ہی کی طرح کی ہے، ان کو اور ان کے لڑکے کو دیکھ کر خوشی ہوئی، مسلم انسٹیٹیوٹ کے لوگ بھی
ملنے کے لئے آگئے تھے، میں مولانا تقی امینی کے ساتھ خوش تھا کہ سفر بخیر و عافیت رہا۔

لندن | ہم لوگ لندن یونیورسٹی کے ہوسٹل میں لائے گئے، اس کے سامنے مسلم انسٹیٹیوٹ کا دفتر ہے،
ہر کمرہ میں ایک ایک مہمان کے ٹھہرنے کا انتظام تھا، ہندوستان کی اچھی سے اچھی یونیورسٹیوں کے ہوسٹل
کے مقابلہ میں یہ ہوسٹل بدرجہا بہتر اور عمدہ تھا، کمرہ میں ایک بہت آرام دہ بیڈ، ایک میز، دو بہت اچھی
کرسیاں، ایک تپائی، دو شیلف، ایک وارڈروب اور ایک بڑا ہیٹر اور دو آئینے تھے، کمرہ کے اندر ہی
ہاتھ منہ دھونے کا بیسن تھا، فرش پر ایک اچھے قسم کی مخملی فٹنگ تھی، جو گیلری اور زینہ پر بھی ویسی
ہی تھی، باتھ روم اور ٹوائلٹ کمرہ کے اندر تو نہیں لیکن بالکل ملے ہوئے تھے، مسلم انسٹیٹیوٹ کے
لوگ بڑے اخلاق سے ہر قسم کی سہولت بہم پہونچانے میں لگے رہے، دو بجے لنچ تھا، ہوائی جہاز پر
ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا مل گیا تھا، اس لئے کھانے میں شرکت نہیں کی، عزیزی فاتح کمرہ میں
بٹھا کر اپنے گھر جارہے تھے کہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کے صاحبزادے برادرم
سید سلمان ندوی سمینار میں شرکت کے لئے جنوبی افریقہ سے پہونچ گئے، ان کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، ان

کو گلے سے لگایا، انھوں نے اپنا کمرہ میرے پاس ہی منتخب کیا، پھر تو ان کی وجہ سے ہر قسم کا آرام
ملا، اپنی سعادت مندی سے بہت ہی عزیزانہ طور پر ملتے رہے.....
مولانا تقی امینی نے کوئی اور کمرہ اپنے لئے پسند کیا، ان کے قدرداں کافی مل گئے، پھر ان کا وقت
بہت اچھا گذرتا رہا، نماز باجماعت کا بڑا اچھا انتظام تھا، ظہر کی نماز کا وقت دو بجے، عصر کا
وقت ۶ بجے، مغرب کا وقت ۹ بجے، اور عشاء کا وقت ۱۱ بجے رات، اور فجر کی نماز کا وقت
۴ بجے بتایا گیا، بیت المقدس کی مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید السعد تمیمی بھی سمینار میں مدعو
تھے، ان کی داڑھی عربوں کی طرح چھوٹی نہیں، ہندوستان کے علماء کی طرح لمبی تھی، قد لمبا اور
بدن بھاری تھا، ان ہی کی امامت میں نمازیں ادا ہوتی رہیں، وہ فجر کی نماز میں دعائے قنوت
اہتمام سے پڑھتے، مسافرت کے خیال سے ظہر اور عصر پھر مغرب اور عشاء کی نمازیں ساتھ ساتھ پڑھ لیتے،
ان کے پیچھے ہر مسلک کے مقتدی جماعت میں شریک ہوتے رہے، یہاں سے قبلہ مشرق کی طرف
ہے، اس لئے نمازیں مشرق کی سمت ادا ہوتی رہیں، ڈنر چھ بجے شام کو ہوتا، پھر آٹھ بجے صبح کو ناشتہ
کے لئے ہم لوگ جمع ہوتے، بعض مہمانوں کو یہ طویل وقفہ گراں گزرا، کھانا لینے کے لئے ایک کمرہ
میں جانا پڑتا، جہاں ایک طشت میں کھانے کی چیزیں لے کر ڈائننگ ہال کی میزوں پر آکر بیٹھ جاتے،
کھانے میں انگریزی اور ہندوستانی چیزیں ملی جلی رہتیں، سلاد یہاں کھانے کا ضروری جزء ہے، مثلاً
ٹماٹر، کھیرے اور بعض چینی پھلوں کی قاشیں اور ان کے پتے بھی ہوتے، کسی پھل کا جوس ضرور
ہوتا، املٹ اتنا بڑا ہوتا کہ اسی سے پیٹ بھر سکتا تھا، مچھلی کے بڑے بڑے تلے ہوئے قتلے، پھر
تنوری روٹی یا ڈبل روٹی کی سلائس بھی ہوتی، پلاسٹک کے فنجان میں دہی ہوتا، پھر آخر میں آئس کریم
بھی ہوتی، پانی کے بجائے چائے یا کافی استعمال کرتے، میں تو بڑی احتیاط سے کھانا کھاتا، مولانا
تقی امینی کو یہ کھانا راس نہیں آیا، اور وہ تیسرے ہی دن بیمار پڑ گئے۔

موسم

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں سردی کافی ہوگی مگر موسم ایسا تھا کہ ہم لوگ گرمی ہی کے کپڑے پہنے رہے، بعض انگریز مرد تو گرمی کی وجہ سے ننگے بدن دکھائی دیئے، لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پر بھی کم سے کم لباس دیکھا، ہم لوگوں کے آنے کے تیسرے دن بارش ہوگئی، تو ایک روز اچھی خاصی سردی رہی، مگر پھر موسم گرم ہوگیا، یہاں کے لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی گرمی لندن میں بہت دنوں کے بعد پڑی، اگست کے آخر تک برابر گرمی رہی۔

سیمینار کی ایک غیر رسمی نشست

پہلی اگست کو سیمینار کی ایک غیر رسمی نشست ہوئی، جس میں اس کے متعلق جناب ظفر احمد بنگش صاحب نے ضروری معلومات فراہم کئے، وہ کنیڈا سے آئے ہوئے تھے، وہاں کرسینٹ اخبار کے اڈیٹر ہیں، اس کے بعد مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید التمیمی کی ایک تقریر ہوئی جس میں انھوں نے قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے دے کر بتایا کہ ان میں یہودیوں کی ذلت آمیز شکست کی بشارت ہے، اور ان کی شکست کے بعد احیائے اسلام ہوگا، ان کی زبان سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ بعض عرب حکمران اسرائیل کے وجود کے خواہاں ہیں تاکہ ان کی حکومت قائم رہے، اور یہ سن کر اور بھی تعجب ہوا کہ گولان، لبنان اور بیروت کی لڑائیاں خود عرب حکمرانوں کی سازش سے ہوئیں، ایسی باتیں یقین میں نہیں آتیں، مگر امام صاحب یہ سارے الزامات رکھتے چلے گئے، ان کی تقریر کے ترجمے انگریزی اور اردو میں بھی ہوئے، وہ بول چکے تو ان سے بہت سے سوالات کئے گئے، ان پر یہ بھی اعتراض ہوا کہ وہ قرآن کی بعض آیتوں کو صحیح نہیں سمجھے ہیں، ایک صاحب نے یہ بھی کہا کہ مشرقِ وسطیٰ کی لڑائیوں میں قرآن پاک کی آیتوں کا سہارا لینا مناسب نہیں، کیونکہ یہ لڑائیاں مومنین اور کفار کی نہیں ہیں، پی۔ ال۔ او کے تمام لوگ کب مسلمان ہیں، وہ جہاد کا جذبہ نہیں رکھتے ہیں، شیخ تمیمی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پی۔ ال۔ او کی کمزوریوں سے وہ خود اچھی طرح واقف ہیں، لیکن وہ ستائے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے جذبات کا اندازہ اسی روشنی میں

لگانا چاہئے۔

۳۱ر جولائی کی شام کو لندن میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے میزبان جناب سرور احمد صاحب مجھکو تلاش کرتے ہوئے میرے کمرہ میں پہونچ گئے، اور مولانا اور برادرم مولوی محمد رابع ندوی کے خطوط کے ساتھ ٹائپ کیا ہوا اس خطبہ کا مسودہ بھی دیا، جو مولانا نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں دیا تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک اسلامک سنٹر قائم ہوا ہے، اسی کے افتتاح کے لئے مولانا مدعو کئے گئے تھے، وہ ۲۱ر جولائی کو لندن پہونچ گئے تھے، دہلی میں خبر مل گئی تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک انگلستان میں قیام نہ کرسکیں گے، اور ۳۱ر جولائی کو دہلی پہونچ جائیں گے، لندن میں ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا، مسرور احمد صاحب نے انگلستان میں ان کی سرگرمیوں کی تفصیل بتائی، وہ کچھ دیر کے بعد چلے گئے، تو مولانا کا خطبہ پڑھنا شروع کیا، مگر ابھی پورا پڑھ نہیں پایا تھا کہ کمرہ میں برادرم سلمان ندوی آگئے، اور اس کو دیکھتے ہی کہا کہ وہ پہلے خود پڑھیں گے، وہ لیگئے توپھر ان سے واپس نہ مل سکا۔

یو۔کے۔ اسلامک مشن

یکم اگست کو برادرم سلمان ندوی کے ساتھ یو۔کے (یونائیٹڈ کنگ ڈم) اسلامک مشن گیا، جس کی دعوت پر مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی ہند اس کے ایک سالانہ اجتماع میں آنے والے تھے، یہ اسلامک مشن ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا، اس کا مقصد یورپ میں مسلمانوں کو مذہبی، دینی، تمدنی، ثقافتی اور نفسیاتی جذبات و احساسات کو باقی رکھ کر ان کو یورپ کے نظری اور فکری حملوں سے محفوظ رکھنا ہے، اس کی تنظیمیں اور شاخیں انگلستان کے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی ہیں، نام کے لحاظ سے تو نہیں مگر دراصل یہ جماعت اسلامی کی ترجمان ہے، اس کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی صاحب ہیں جنھوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے، بڑے خلیق اور ملنسار ہیں اور گفتگو بھی بہت اچھی کرتے ہیں، حال ہی میں ایران گئے ہوئے تھے، وہاں کے انقلاب سے بہت

متاثر ہوکر آئے، ان کے یہاں سے اردو کا ایک رسالہ سفیر بھی نکلتا ہے جس میں انھوں نے ایک مضمون
میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، اس کی سرخی یہ تھی:

"ایران میں آغاز اسلام کا سماں نظر آیا،" "انقلاب نے پوری قوم کی کایا پلٹ دی"

مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ

"اسلامی انقلاب کی حفاظت و کامیابی کے لئے پوری قوم کو سپاہ اسلام ہونے کا ناقابل
تسخیر جذبہ عطا کر دیا ہے، نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا، بلاتخصیص زن و مرد، بچے اور بوڑھے
سب ہی جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں اور ملک و دین کے لئے جان نثار کرنے کو فلاح و سعادت
کی معراج خیال کرتے ہیں، اس لئے وہ اپنے سارے چھوٹے بڑے اختلافات ختم کر کے
اسلام کے جھنڈے تلے ملت واحدہ بن کر مصروف ہیں۔"

اس کو پڑھ کر میں نے ان سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کے ہندوستانی
دوست شاید اتفاق نہ کریں، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے اوپر جو اثر ہوا، اس کو صحیح
لکھ دیا ہے، اسی دفتر میں دوران گفتگو ایک پاکستانی صاحب نے بیان کیا کہ کراچی یونیورسٹی کے
کچھ سنی طلبہ طہران گئے تو وہاں کی ایک مسجد میں علحدہ جماعت کی، وہاں کے علما نے ان کو علحدہ نماز
پڑھتے دیکھا تو دوسرے وقت ان ہی میں سے ایک لڑکے سے اصرار کر کے اپنی نماز کی امامت کرائی،
تاکہ یہ معلوم ہو کہ انھوں نے اس قسم کی تفریق ختم کر دی ہے۔

اسلامک مشن میں جانے کی وجہ یہ بھی ہوئی تھی کہ اس کے ڈائرکٹر جناب رشید احمد صدیقی کے
ذریعہ سے حج کا ویزا حاصل کروں، انھوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا، یہاں معارف کے پرانے
مضمون نگار جناب مولانا عبدالحلیم چشتی سے مل کر خوشی ہوئی، وہ نائجیریا سے وہاں آئے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کی طرف سے ناشتہ ۲؍اگست کو مسلم انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی

صاحب نے سمینار کے کچھ نمائندوں کو اپنے گھر سلاؤ پر بلایا جو مسلم انسٹیٹیوٹ سے ستائیس میل کے فاصلہ
پر تھا، ان کے گھر پر ہم لوگ فرش پر بٹھائے گئے، ناشتہ میں پراٹھے اور شامی کباب تھے، وہاں ایران
کے انقلاب پر گفتگو آئی تو میری زبان سے نکلا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
تمام دشمنوں اور مخالفوں کو معافی دیدی تھی، مگر اس اسوۂ حسنہ پر ایران میں عمل نہیں کیا جارہا ہے،
وہاں تو لوگوں کو گولی مار کر ہلاک کیا جارہا ہے، مجلس کے زیادہ تر شرکاء اس رائے کے تھے کہ وہاں
جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہے، پھر گولی مارے جانے کے اسباب بتاتے رہے، اسلامی سیاست پر گفتگو آئی تو
کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسلام میں ملوکیت کا جواز نہیں، میں نے کچھ دیر تک اس موضوع پر اپنے
خیالات کا اظہار کیا کہ تیرہ سو ستر برس تک ملوکیت رہی، اس کے کارناموں کو نظر انداز کر کے
ہم اپنے ماضی سے کیسے کٹ سکتے ہیں، اگر ان خاندانی حکمرانوں نے شریعت کی بالادستی قبول کر کے
حکومت کی تو وہ غیر اسلامی نہیں قرار دی جاسکتی ہے، کچھ حاضرین نے میرے اس خیال کی تائید کی،
مگر ڈاکٹر کلیم نے کہا یہ حکومتیں مسلمانوں کی رہیں، اسلام کی نہیں تھیں، یہاں جناب کلیم صدیقی صاحب
کے خسر جناب مشفق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو اعظم گڈھ میں اپنی ملازمت کے ابتدائی دور
میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے، پھر بڑے بڑے سرکاری عہدے پاکر ریٹائر ہو چکے ہیں، کلیم صاحب
کی لڑکی کی شادی میں شرکت کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے، وہ بہت ہی اخلاق سے ملے۔

ایک نمائش ۳؍اگست کی سہ پہر کو لندن یونیورسٹی کے ایک ہال میں مسلم انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک
نمائش تھی، اس میں دنیا بھر کی مسجدوں کی تصویریں دیکھنے میں آئیں، ان کو سلائڈ کے ذریعہ سے بھی
دکھانے کا اہتمام تھا، افتتاح کے موقع پر ہال بھرا ہوا تھا، کوئی انگریز نہ تھا، اس لئے معلوم
ہوا کہ ہم دہلی یا لکھنؤ ہی کے کسی اجتماع میں شریک ہیں، تقریب کی ابتدا ایک فلسطینی عالم کی قراءت
سے ہوئی، صدارت مسجد الاقصیٰ کے سابق امام شیخ سعید اسعد تمیمی نے کی، ڈاکٹر کلیم صدیقی نے

مہمانوں کا خیر مقدم کیا، وہ اچھے مقرر بھی ہیں، انھوں نے بتایا کہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر وہ ہر سال نمائش کرتے رہتے ہیں، جن کو یہاں کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں دیکھتے رہتے ہیں، اس سے غیر مسلموں کو اسلام سے متعلق بہت کچھ واقفیت ہوتی رہتی ہے، امام صاحب نے لمبی تقریر جوشیلے انداز میں کی، اس کا ترجمہ انگریزی میں فخر الاسلام صاحب نے کیا، ان کی تقریر سے یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ مسجد اقصیٰ کو اردن کے شاہ حسین یہودیوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہا، امام صاحب کو شاہ حسین دو بار جیل بھجوا چکے ہیں، جیسا کہ خود ان کی تقریر سے معلوم ہوا۔

نمائش میں اسلام پر بہت سی کتابیں مختلف ناشروں کی طرف سے دکھائی گئیں، مسلم انسٹیٹیوٹ کی مطبوعات حسب ذیل تھیں۔

(1) Towards a new destiny by Kalim Siddiqi (1974) (2) Social Change in Islam -The Progressive dimension by Dawud G.Rosser-Owen (3)The Quest for a new Science by x Zia Uddin Sardar (1976) (4) Islamic Revolution in Iran by Zia Uddin Sardar (1976) (5)Beyond the Muslim Nation State by Kalim Siddiqi (1980) (6)The Islamic Movement- A System Approach by Kalim Siddiqi (7)Islamic Revolution: Achievement,Obstacles and Goals by Kalim Siddiqi (8)The State of the Muslim World Today by Kalim Siddiqi (1950) (9) Issues in the Islamic Move-ment 1980-81 by Kalim Siddiqi (1982)

ٹورنٹو سے ایک پندرہ روزہ انگریزی اخبار کریسنٹ انٹرنیشنل نکلتا ہے، اس کے پرچے بھی نمائش میں رکھے ہوئے تھے، ایک ماہانہ رسالہ مسلم میڈیا کے نام سے بھی تھا۔

ووکنگ مین کے بک اسٹال پر حسب ذیل کتابیں دیکھیں:-

(1) Women in Muslim History by Charles Wady (2) Islam and Contemporary Society by Salim Azmi (3)Islam: Continuity and Challenges in the Modern World by John Obery Well (4)Islam and Plight of Modern man by Hassan Nasir (5) A History of Islamic Philosophy by Majid Khan (6) The Muslim Mind by Charles Wady (7) Islam in the Modern World

دی مسلم ٹرسٹ اسکول، اور طہٰ پبلیکیشن کے اسٹال پر اسلام پر کتابیں دیکھیں، انکے نام لکھنے کا موقع نہ مل سکا، اسی طرح اور ناشروں کی طرف سے بھی کتابیں تھیں، جن کو دیکھکر اندازہ ہوا کہ اسلام پر ضروری کتابیں عام مطالعہ کے لئے کافی آگئی ہیں۔

سیمنار کا افتتاح ۳ر اگست کو دس بجے دن میں لندن یونیورسٹی کے ایک وسیع ہال میں سیمنار شروع ہوا، بکثرت نمائندے تھے، جو اردن، ایران، ٹورنٹو، نائیجیریا، رباط، سوڈان، امریکہ، جنوبی افریقہ، مصر، ترکی، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ سے آئے تھے، لباس میں بڑی رنگارنگی تھی، ہر قسم کی صورتیں دکھائی دیں، کچھ مسلمان خواتین ساتر لباس میں تھیں، صدر جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی تھے، نائب صدر چار بنائے گئے، جو اردن، ایران، سوڈان اور فلسطین کے تھے، ظفر الاسلام خاں صاحب سیمنار کے سکریٹری کی حیثیت سے صدر ڈاکٹر کلیم الدین صاحب کے بغل میں بیٹھے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی کا صدارتی خطبہ

ڈاکٹر کلیم صدیقی کے خطبہ میں تحریر کا بڑا زور تھا، ان کا پیرایہ بیان کچھ ایسا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ ان کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ، خاص خاص اصطلاحات اور جملوں کی تراکیب کے سہارے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر رہے تھے کہ سامعین سنیں اور سمجھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں، کسی اہل قلم میں انداز بیان کی یہ خوبی پیدا ہو جائے تو اس کے لئے یہ بڑی دولت ہے۔

لندن کے ایک پلیٹ فارم سے وہ جس جرأت اور بے باکی سے مغرب کے سائنس دانوں کے تخیلات اور مفروضات پر حملہ آور ہوئے، وہ قابل تعریف ہے، انھوں نے ان کو یہ دعوت دی کہ سائنس کے ذریعہ سے ان کو بہت کچھ مل چکا ہے، مگر جو کچھ ان کو نہیں ملا ہے، وہ ان کو اسلام میں مل سکتا ہے، ان کے خطبہ کا وہ حصہ بڑا جاندار تھا جس میں انھوں نے بتایا کہ یورپ کے افکار و تصورات کے ذریعہ سے کیسا انتشار پھیلا ہوا ہے، اس سے انسانی جسم میں روح اور دماغ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں بن گئی ہیں، اسلام یگانگت اور اتحاد کا پیام لایا ہے، لیکن اس میں رخنہ ڈال کر ہر قسم کی انتہا پسندی پیدا کر دی گئی ہے، مذہبی، قبائلی، اور حتی کہ زراعتی اتحاد کی جو بھی تحریکیں چلتی ہیں، ان کو ہر طرح منتشر کر دیا جاتا ہے، پھر مستشرقین نے اسلام کو جن جن طریقوں سے نقصان پہونچایا ہے، ان کی بھی وضاحت کی، مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو جو ضرر پہونچا ہے، اس کا بھی ذکر کیا، ان کے سیاسی نظام کو بدل کر ان میں جو ذہنی، معاشرتی اور تمدنی ضرر رساں تبدیلیاں آئیں، ان کا بھی تجزیہ کیا، اور خود مغربی تمدن اور سائنس کی وجہ سے جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان پر بھی عمدہ تبصرہ تھا، کلیم صاحب کی یہ تحریر مغربی دانشوروں کی نظر سے گذرے گی تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کیسی معروضیت ہے، اور مسلمانوں کے لئے بھی یہ پیام ہے کہ مغربی افکار اور تمدن سے ان کا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا ہے۔

ان کی اس رائے سے کس کو اختلاف ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے افراد، ہماری تعلیم کے مراکز، ہمارے تجارتی، اقتصادی اور سیاسی نظام سب مغربی نظام کے غلام ہیں، ان کے دل کی پکار ہے کہ مسلمانوں کی زندگی، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، اور خصوصاً ان کی سیاست خالص اسلامی رنگ میں ہو، یہ مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے، مگر یہ ترجمانی کرتے وقت کلیم صاحب نے جو کہیں کہیں لب و لہجہ اختیار کیا، اس سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، ماضی میں جو کچھ ہوا، اس پر لعنت بھیجنے کے بجائے مستقبل کو سنوارنے کی خاطر بہتر سے بہتر اسلامی افکار و تصورات پیش کئے جائیں تو زیادہ مفید اور مؤثر ہو سکتا ہے، ماضی میں تاریخ کا جو فیصلہ ہو چکا ہے، وہ اب بدلا نہیں جا سکتا اس سے خواہ کتنا ہی تکدر پیدا ہو، وہ اسلام یا مسلمانوں کی تاریخ کا جز بن چکا ہے، ملوکیت کیوں قائم ہوئی، اس سے کیا نقصان پہونچا، علماء نے ملوکیت کا ساتھ کیوں دیا، ان کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کی، علماء کا جو کردار ہونا چاہئے وہ کیوں نہیں بروئے کار آیا، ان موضوعات پر ایک مورخ تو بحث کر سکتا ہے، مگر جو مسلمانوں میں اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں، ان کے سامنے تو صرف یہ ہونا چاہئے کہ اب کیا ہو، اور جو کچھ ہو، وہ کس طرح ہو، مستقبل کو سنوارنے کی دعوت دینے میں اگر ماضی کو برا کہا جائے تو مناظرانہ اور مجادلانہ رنگ پیدا ہو سکتا ہے، جو دعوت و عزیمت کے سلسلہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، موجودہ دور کے مسلمانوں کی اکثریت مسلمان بن کر زندگی گذارنا چاہتی ہے، وہ اپنے معاشرہ، اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی سیاست میں اسلامی رنگ چاہتی ہے، مغربی تمدن اور سیاست دونوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بیزار ہو چکی ہے، وہ دکھی بنی ہوئی ہے، اور اپنے دکھ کے علاج کے لئے مسیحا کی تلاش میں ہے، اچھا مسیحا اپنے مریض کے گذشتہ امراض کو جان کر اس کو ڈانٹ نہیں پلاتا کہ ایسے امراض میں کیوں مبتلا ہوا، بلکہ اس کو توانا اور تندرست بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے، مسلمانوں کے جو جذبات پیدا ہو رہے ہیں، ان کا صحیح امالہ کر کے ان کے

لئے صحیح سمت متعین کرنے کی ضرورت ہے جس کے لئے ایک خاص لب و لہجہ ہونا چاہئے، یعنی خوشگوار، تنقید و تنقیص سے بالاتر، دل نشیں بلکہ سحر حلال۔

کس مسلمان کو خواہش نہیں کہ امت متحرک ہو، قرآن مجید کی بشارت کے مطابق تو اس کو خیر الامت ہونا چاہیئے، وہی بنی نوع انسان کے لئے پیام انسانیت دے سکتی ہے، مغربی تمدن سے دنیا جس طرح مسخ ہو رہی ہے، وہی دور کر سکتی ہے، اور اپنے رحمۃ للعالمین پیغمبرؐ کے مشن کو دنیا میں پھیلا سکتی ہے، اور جو کوئی اس کو اس فرض کے انجام دینے کی دعوت دے گا، اس کے لئے لبیک اللھم لبیک کہہ کر بڑھ سکتی ہے، مگر اس للکار میں ماضی میں جو کچھ ہوا اس پر پھٹکارنا مناسب ہے، عام طور سے جب کوئی نئی تحریک یا نئی دعوت پیش کی جاتی ہے، تو اس کو کامیاب بنانے کی خاطر اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے اس پر جارحانہ تنقیدیں کی جاتی ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ انداز کامیاب بھی ہو جائے، اس سے اختلاف پیدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، جس سے گروہ بندی شروع ہو جاتی ہے، حق وصداقت کا اعلان کرنا خوبی ہے، مگر اس اعلان سے ضرر پہونچ جانے کا احتمال ہو تو اس کو نظر انداز کرنا مصلحت اندیشی کے خلاف نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بادشاہت یا خاندانی حکومت اب زمانہ کا مذاق نہیں رہا، مسلم امہ فرنگی جمہوریت نہیں، بلکہ اسلامی جمہوریت چاہتی ہے، مگر کسی خاص حکومت کا نام لے کر اس کو ناجائز قرار دینے میں اصل مقصد کی ترویج کو نقصان پہونچانا اور تنازعہ پیدا کرنا ہے، جس زور شور سے یہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ بادشاہت اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، اسی قوت اور طاقت سے یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں طرز حکومت کی نوعیت پر زور نہیں دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ اور قرآن و سنت کے احکام کی تعمیل پر اصل زور ہے اور جس حکومت میں ان دو چیزوں کی بالادستی ہو، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہے، چاہے یہ حکومت بادشاہت یا جمہوریت یا آمریت ہی کیوں نہ ہو، یہ بات بظاہر عجیب سی معلوم ہوگی کہ

بادشاہ یا امہ قرآن اور سنت کے احکام کا پابند کیسے ہو سکتا ہے، لیکن اگر تاریخ میں ایسی مثالیں ہوں کہ بادشاہوں نے اپنی بادشاہت کے زمانے میں شریعت کی پابندی کر کے اسلام اور اسلام کے پیرووں کے لئے روشن کارنامے انجام دیئے، تو کیا وہ اس لئے حقارت کی نظروں سے دیکھے جائیں گے کہ یہ ملوکیت کے ذریعہ سے انجام پائے۔ ملوکیت کا کوئی سربراہ اگر متقی، پرہیزگار، عابد، خدا ترس اور شریعت کا پابند ہو، تو کیا وہ اس لئے برا سمجھا جائے گا کہ وہ ملوکیت کی نمائندگی کرتا ہے، مسلم امہ کی رائے سے کوئی سربراہ منتخب ہو جائے اور وہ فاسق و فاجر ہو جائے تو کیا وہ اس لئے قابل قبول ہوگا کہ امہ نے اس کا انتخاب کیا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ امہ غلط سربراہ انتخاب نہیں کر سکتی، مگر یہ ضروری نہیں، اس کا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے؛ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین کے وارث اہل تقویٰ ہوں گے، اہل تقویٰ کا انتخاب کون کرے گا، عام امہ یا صرف اہل تقویٰ، ساری امہ تو اہل تقویٰ ہو نہیں سکتی، اس لئے اہل تقویٰ کا انتخاب اہل تقویٰ ہی کریں گے، اور اہل تقویٰ ہی میں سے کسی متقی سربراہ کا انتخاب ہو سکتا ہے، مگر اس کے انتخاب کا حق صرف اہل تقویٰ ہی کو ہوگا، تو کیا امہ اپنے حق سے دست بردار ہو کر اہل تقویٰ کے حق کو تسلیم کر لے گی، اور ان کی رائے امہ ہی کی رائے سمجھی جائے گی، اور اگر نہیں سمجھی گئی تو پھر امہ اور اہل تقویٰ میں جو آویزش ہوگی، اس کا حل کیسے نکلے گا۔

کلیم صاحب نے امہ کے پولیٹکل کلچر کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، واقعی ہماری امہ سونے کا ظرف رکھتی ہے، جس میں ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں زنگ لگ جائے، مگر اس کو کھرچنے والا کوئی مل جاتا ہے تو وہ کندن کی طرح چمک اٹھتی ہے، مگر یہی امہ کبھی شیر بن کر درندگی پر بھی اتر آتی ہے، کبھی ہاتھی بن کر مستانہ وار چلنے لگتی ہے، تو اس میں زنجیر لگانا مشکل ہو جاتا ہے، اور کبھی بکری کے بچہ کی طرح معصوم اور انٹر بن جاتی ہے، امہ اگر درندگی پر اتر آئے، یا مست ہاتھی کی طرح [illegible]

یا کسی زمانہ میں بدعتی، اباحتی، فاسق اور فاجر بن جائے یا علٰحدہ علٰحدہ ٹکڑوں میں بٹ کر اپنے اپنے
مسلک کی خاطر تشدد پسند ہو جائے، تو اگر کوئی آمر حضرت عمرؓ کی طرح ہاتھ میں درّہ لے کر ان کو اللہ
اور اس کے رسول ؐ کے احکام کا پابند بنائے، تو کیا وہ اس لئے قابل قبول نہ ہوگا کہ وہ آمر ہے، یا
اگر یہی امہ اپنی معصومیت میں اطاعت گذار اور صلح پسند بن کر اور اپنی جان اور ایمان کو محفوظ
پا کر کسی بادشاہت یا خاندانی حکومت یا آمریت کو گوارہ کرے تو کیا اس کا یہ پولیٹکل کلچر نظر انداز
کئے جانے کے لائق ہے، اور اگر اس کا پولیٹکل کلچر واقعی بہت قوی تھا تو ماضی میں خاندانی حکومت
کو کیوں برداشت کرتی رہی، جہاں اس کی وجہ یہ بتائی جاسکتی ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں نے
اس کی مرضی کے خلاف اس کو اپنا اطاعت گذار بنالیا۔ وہاں یہ بھی وجہ بتائی جاسکتی ہے کہ جس
حکومت سے وہ مطمئن رہی۔ اس کو گوارا کرتی رہی، خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو، اور یہی اس کے
پولیٹکل کلچر کا تقاضا تھا۔

امہ کا پولیٹکل کلچر دراصل تو یہ ہے کہ ہر جگہ خلافت راشدہ کی ایسی حکومت ہو، مگر جہاں
ایسی نہ ہو وہاں اگر حکومت نے شریعت کی بالادستی قبول کرلی، گو یہ زبانی اور کاغذی سہی، یا اگر
ایسی حکومت سے امہ کی مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت کی پاسبانی اور نگہبانی کی ضمانت ملتی رہی تو امہ
کو اپنا پولیٹکل کلچر بنا کر حکومت کی معاون ہوگئی، پھر اس کو اس کی فکر نہ رہی کہ حکومت کا سربراہ
کیا ہے، اور اس کا طرز حکومت کیا ہے، اس سے کس کو انکار ہے کہ اسلامی حکومت کی روح یہ ہے
کہ اس کے ہر شعبہ میں تقویٰ اور طہارت ہو، اور اگر کسی وجہ سے یہ میسّر نہ ہو، تو یہ بھی تاریخی حقیقت
ہے کہ امہ نے صرف مذہبی حمیت کے نگہبانوں اور ایمانی غیرت کے پشتیبانوں ہی سے سمجھوتہ کرلیا ہے
گو ایسی نگہبانی اور پشتیبانی ظاہری طور پر اپنی اپنی حکومت کی بقا ہی کی خاطر کیوں نہ رہی ہو، اور
اب بھی جب تک کہ خلافت راشدہ کے ایسا دور کہیں نہ ہو، اس وقت تک ہم کو جذبات کے بجائے

باہم مل کر راہ نجات تلاش کرنی ہوگی۔

رہا ان علماء کے کردار پر تنقید کرنا جو بادشاہوں کے حاشیہ نشین رہے، تو اس حقیقت سے انکار
نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی حاشیہ نشینی رائگاں نہیں گئی، وہ بادشاہت کو تو اسی طرح ختم نہ کرسکے جس طرح
کہ امہ کا پولیٹکل کلچر اس کو ختم نہ کرسکا، مگر ان ہی علماء کا فیض ہے کہ ان کے زمانہ کے حکمراں جیسے بھی رہے
ہوں، انھوں نے کم از کم رسمی اور ظاہری طور پر دین کا نمائندہ بن کر حکومت کرنا پسند کیا، اور لقب اختیار
کرتے وقت اللہ اور دین کا جز ضرور شامل کیا، پھر ان حکمرانوں میں کس کی حکومت ایسی رہی جس میں شریعت
کی مکمل پابندی نہ سہی، اس کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، شیخ الاسلام، صدر الصدور، قاضی القضاۃ، مفتی
اور محتسب وغیرہ جیسے اور عہدے تو اسی لئے تھے کہ وہ امہ سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی
پابندی کراتے رہیں، اگر امہ نے پابندی نہیں کی تو اس میں ان حکمرانوں یا ان کے علماء کو مورد الزام
ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہوگا، اگر کوئی یہ کہے یہ سارے ادارے اسلام کی خاطر نہیں بلکہ خاندانی حکومت
کے تحفظ کے لئے قائم ہوتے رہے تو اسی طرح کی بدگمانی سے اسلام کی کسی دعوتی تحریک پر کوئی یہ اعتراض
کرے کہ یہ تحریک اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی قیادت اور مفاد کی خاطر چلائی گئی ہے تو کیا یہ
صحیح ہوگا، اور اگر کسی کی ذاتی قیادت پیدا ہو بھی جائے، اور اس سے اسلامی دعوت کو فائدہ
پہونچ جائے تو کیا یہ اس لئے قابل قبول نہ ہوگا کہ اس سے کسی کی ذاتی قیادت پیدا ہوگئی،
خاندانی حکومتیں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا بھر میں قائم ہوتی رہی ہیں اور آج ان کا تاریخی مطالعہ
اس حیثیت سے کیا جارہا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا اور دنیا کے لوگوں کو کیا ملا، ہم اپنی تاریخ کا
بھی مطالعہ اسی خیال سے کریں۔

علماء نے وقت کے تقاضے کی بنا پر ان حکومتوں کا ساتھ ضرور دیا، اور کچھ علماء ایسے بھی
تھے جو حکومت کے محض حاشیہ نشین بنے رہے، مگر اسی زمانہ میں ایسے علماء بھی تھے جنھوں نے اپنے

فکری اور علمی جہاد سے امہ کا ذہن اسلامی بنائے رکھا، اس کی تاریخ تو زریں حروف سے لکھی جا سکتی ہے، ان ہی کے فیوض و برکات سے ہماری امہ میں ایمانی حرارت باقی ہے، ان کے اس کارنامہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سنی اور شیعہ علماء کا تجزیہ کرنے میں کسی ایک کو بہتر قرار دینا بھی مناسب نہیں، اس بحث کو چھیڑ کر خواہ مخواہ تنازعہ پیدا کرنے کی دعوت دینا ہے۔ علماء کے کردار پر کلیم صدیقی صاحب کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا پورا حق تھا، وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام نامی لئے بغیر بھی کہہ سکتے تھے، ان کی تحریر کے وزن میں کوئی کمی نہ آتی اسی طرح اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی پر چھینٹے ڈالنے کی ضرورت نہ تھی، سرسید اور جناح کو بھی مطعون کئے بغیر اپنی رائے پیش کر سکتے تھے، کوئی دعوت کا دعویٰ دار ہو تو پھر اس کو عزیمت کے ایسے پل صراط پر چلنا ہوتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار کی طرح ہوتا ہے، قلم کا بھی عجیب اعجاز ہوتا ہے، یہ شعلہ بھی برسا سکتا ہے اور پھول بھی بکھیر سکتا ہے اور یہی قلم ہر آدمی کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔

عوام کے پولیٹکل کلچر کا تجزیہ کرتے وقت کلیم صاحب کا یہ لکھنا صحیح ہے کہ مسلمان عوام یعنی امہ کی تاریخ موثر طریقہ پر لکھنے کی ضرورت ہے، اور یہ نہیں لکھی گئی تو یہ افسوس کی بات ہے، ان کی اس رائے سے پورا اتفاق کیا جا سکتا ہے، ضرور لکھی جانی چاہئے، اور لکھی بھی گئی ہے، مگر خود عوام کو اپنی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بجائے اپنے بادشاہوں ہی کی تاریخ پڑھنے میں لذت ملتی رہی، کلیم صاحب جس امہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں وہ زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کے خاندان والوں اور چاروں خلفاءؓ کے حالات ہی کو پڑھ کر اپنے سوچنے کے ظرف کو باقی رکھے ہوئے ہے، عوام کے کارنامے یا ان کی ثقافتی، ذہنی اور معاشرتی تاریخ کا مطالعہ تو اونچے قسم کے دانشوروں کے لئے ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں الگ چیزیں نہیں، اور جو لوگ

اس کے قائل ہیں کہ مذہب سیاست کو بگاڑتا ہے، تو ان کا یہ خیال غلط فہمی کی بنا پر ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سیاست، مذہب کو بگاڑتی ہے، مذہب تو سیاست کو سنوارتا ہے، اور جو لوگ اس کے حامی ہیں کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے، وہ وہی ہیں جو اسلام کی تعلیم سے انحراف چاہتے ہیں، جن لوگوں کے ذہن پر مغرب کے سیاسی تصورات و افکار چھائے ہوئے ہیں، ان کے لئے مذہب اور سیاست کا ملانا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، ان کے یہ اثرات ختم ہو جائیں تو یہ مشکل نہیں، البتہ اس سلسلہ میں فرقہ وارانہ عصبیت کے حائل ہونے کا خطرہ ضرور ہوتا ہے، پاکستان میں اسلامی نظام کی آواز اٹھی تو فرقہ واریت بیچ میں حائل ہو گئی جس کے بعد نظام اسلامی کے بجائے نظام مصطفےٰ کی اصطلاح میں پناہ لینی پڑی، معصومانہ خواہش تو یہی ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام اسلامی نظام ہو، مگر جہاں اسلام کے مختلف فرقے ہوں، وہاں ان مختلف فرقوں کے عقائد اور مسلک کو ملا کر اسلام کے سیاسی نظام کا عطر مجموعہ تیار کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں گی، ان کو حل کرنے میں عزم، استقلال اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔

کلیم صاحب کا خیال ہے کہ مسلم امہ دعوت، چیلنج جہاد اور انقلاب کے ذریعہ سے اپنی دنیا بدل سکتی ہے، اس سے پورا اتفاق ہے، ہماری تاریخ میں ایسے ایسے خوں ریز انقلابات کی مثالیں ہیں جن کی تفصیل پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، یہ خوں ریزی اسلام ہی کے نام پر ہوتی رہی، مگر اس کا رخ بدلتا رہا، اس کی دو مثالیں خود کلیم صاحب نے پاکستان اور الجیریا کی دی ہیں، اسی لئے ایران کے موجودہ انقلاب کو دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دیکھا جائے تو اس دھڑکن کو مطعون کرنا بھی صحیح نہیں، ایران میں جو اسلامی انقلاب آیا ہے، اس پر خوشی کا اظہار ضرور کیا جانا چاہئے، بلکہ اس کو ہر طرح کامیاب بنانے کے لئے مدد بھی پہونچانے کی ضرورت ہے، مگر اس کی تاریخ ابھی لمبی نہیں، پاکستان اور الجیریا کے لئے بھی اسلام کا نعرہ بلند ہوا، مگر وہاں جو کچھ ہوا، وہ معلوم ہے، تو پھر کوئی یہ سوچے کہ معلوم نہیں ایران کا یہ انقلاب کیا رخ اختیار کرے، تو اس سے آزردہ ہونا بھی صحیح نہیں، وہاں کے

متعلق اب تک جو کچھ سننے میں آرہا ہے، وہ ضرور خوش آیند ہے، اور جس طرح ایک مذہبی عالم نے وہاں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا اس پر مسلمانوں کا مذہبی طبقہ فخر کر سکتا ہے، اور اس انقلاب کو تقویت پہونچائی جائے تو صحیح ہوگا، مگر بعض ان احتمالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کا یہ انقلاب خالص اسلامی انقلاب ہونے کے بجائے کہیں ایسا انقلاب نہ ہو جائے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے نمونے کا کام نہ دے سکے۔

یہ پیام تو بہت پرانا ہے کہ ع کچھ بڑی بات نہ تھی ہوتے جو مسلماں بھی ایک۔
اور امہ کی یہی خواہش ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں، مگر ایک ہو جانے میں جو خوش فہمی، یا غلط فہمی یا سادہ لوحی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے، اس پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے، تمام اختلافات کو مٹا کر اتفاق و یگانگت کا عطر مجموعہ تیار کرنا آسان نہیں، اگر یہ تیار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی خوش بختی کیا ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر کلیم صدیقی صاحب کے خطبہ پر میرا یہ تبصرہ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے، مگر جس مخلصانہ جذبہ کے ساتھ لکھا گیا ہے، اسی جذبہ کے ساتھ امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہمنوا پڑھنے کی کوشش کریں گے

سیمنار | ڈاکٹر کلیم صدیقی کے خطبہ کے بعد اصل سیمنار شروع ہوا، مقالات بکثرت آئے ہوئے تھے، جو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں تھے، پہلے روز کے مقالات یہ تھے:

(۱) اسلام میں سیاسی خیالات کی اہمیت از شیخ اسعد التمیمی (سابق امام مسجد اقصیٰ)

(۲) قرآن میں سیاسی افکار از عبد الکریم بیازار (ایران)

(۳) اسلامی ریاست میں اقتدار اور اطاعت از ڈاکٹر محمود ایوب (ٹورنٹو یونیورسٹی)

امام تمیمی بڑے اچھے مقرر کیا بلکہ اچھے واعظ تھے بے تکان بولتے، خود بھی جوش میں بھر جاتے

اور سامعین کو پر جوش بنا دیتے، کوئی مقالہ لکھ کر تو پیش نہیں کیا، لیکن بولنا شروع کیا تو بولتے چلے گئے، اس کا خیال نہیں رکھا کہ سیمنار میں سامعین کو محدود وقت میں مخاطب کرنا ہوتا ہے، ایران کے مقالہ نگار نے اپنا مقالہ متین لب ولہجہ میں آہستہ آہستہ پڑھا، اور تقریباً ۴۵ منٹ میں ختم کیا، اسٹیج پر ڈاکٹر محمود ایوب آئے تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ نابینا ہیں، انگریزی میں بولے، تو تمام حاضرین ان کی خطابت سے متاثر تھے، شیعہ تھے، لیکن اسلام کے نظری فکری اور عملی سیاسی خیالات کو اس طرح پیش کیا کہ کسی سنی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی نشست ایک بجے ختم ہوگئی، پروفیسر محمود ایوب کے علاوہ اور مقالہ نگاروں نے وقت کا لحاظ نہیں رکھا، بعض مقالہ نگاروں نے تو اپنا مقالہ ایک گھنٹہ میں ختم کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دوسرے مقالہ نگاروں کو اپنا مقالہ پڑھنے میں بہت کم وقت ملا، بعض مقالے تو پڑھے ہی نہیں جاسکے، ایسے سیمناروں میں وقت کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ ہر مقالہ نگار کو ۱۵ منٹ دیئے جاتے ہیں، مگر اس سیمنار میں اس کی پابندی نہیں ہو سکی،

دوسری نشست تین بجے شروع ہوئی، پہلا مقالہ ایران کے آیت اللہ الجنتی کا "مذہب اور سیاست" کے عنوان سے تھا، ان کے بعد مولانا محمد تقی امینی (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) نے عربی میں "الفکر السیاسی فی القرآن" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا، اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی (ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ) نے اسلامی سیاست پر انگریزی میں ایک تقریر موثر انداز میں کی، پھر میری باری آئی، میرا مقالہ انگریزی میں "اسلامی ریاست کا تصور نظری اور عملی حیثیت سے" کے عنوان سے تھا، یہ انتیس ۲۹ صفحے پر مشتمل تھا، وقت کی کمی کی وجہ سے اس کے خاص خاص ٹکڑے پڑھ کر سنائے، مگر یہاں پر ہم اس کی تھوڑی سی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں اسلامی حکومت کی نوعیت متعین نہیں کی گئی ہے، ہمارے رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی واضح ہدایت نہیں دی ہے کہ حکومت کی نوعیت کیا ہو، اس کے سربراہ کا انتخاب کیسے ہو، اس کو غیر واضح رکھنا مصلحت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، تاکہ لوگ زمانے کے تقاضے اپنے سیاسی مصالح اور جغرافیائی حالات کی بنا پر جیسی حکومت چاہیں قائم کرتے رہیں، البتہ حکمرانی کے اصول و رموز قرآن پاک اور احادیث میں واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں، قرآن پاک میں ہے کہ مسلمان ایک امت کی حیثیت سے اعلیٰ اور اشرف ہوں، دنیا کی قوموں کے درمیان صدر ہوں، وہ بہترین گروہ بن کر انسان کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں اتریں، وہ نیکی کا حکم دیں اور بدی کو روکیں، اور اگر ان کی حکومت قائم ہو تو وہ تسلیم کریں کہ ملک اور حکومت کا اصل مالک خداوند تعالیٰ ہے، وہی حکومت دیتا ہے، اور وہی چھین بھی لیتا ہے، وہی زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے، اور جب وہ ساری کائنات کا مالک ہے تو اسی کے احکام کی بالا دستی ہونی چاہئے، اس کا حکم ہے کہ زمین کی حکومت کے وارث نیک بندے اور عبادت گذار ہوں گے، ان کا انتخاب کیسے ہو، اس کی وضاحت کلام مجید میں نہیں، لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے، اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی تلقین ضرور ہے گو یہ سیاست کے سلسلہ کی نہیں ہے بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے لئے ہے، اس کا اطلاق سیاست پر بھی ہو سکتا ہے، اس کی رو سے باہمی مشورے سے حکومت کے لئے نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب ہو، مگر اس کی بھی وضاحت نہیں کہ پہلے سربراہ حکومت کا انتخاب ہو جو مجلس شوریٰ کی تشکیل کرے یا پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو جو سربراہ حکومت منتخب کرے، یہ لوگوں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، اگر پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو، تو اس کا انتخاب کون کرے گا، اصول تو یہ ہونا چاہئے کہ نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب نیک بندے اور عبادت گذار ہی کریں، اس طرح یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بالغ کو اس انتخاب میں لینے کا حق ہے، پھر یہی مجلس شوریٰ حکومت کے سربراہ کا انتخاب کر سکتی ہے، جس کے لئے ان شرائط کا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین

دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے، حالت خوف کو امن سے بدل دے، اللہ کی بندگی کرے، اور کسی کو شریک نہ جانے، پھر وہ اللہ کے احکام کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، چوروں، زانیوں اور شرابیوں کو خاص خاص قسم کی سزا دے تاکہ معاشرہ ان برائیوں سے پاک رہے، وہ معروف کی ترویج اور منکر کا استیصال کرکے دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتے، کیونکہ خدا چاہتا تو ساری دنیا کو ایک عقیدہ کا بنا دیتا، ان شرائط کی پابندی جو بھی کرے وہ حکومت کا سربراہ ہو سکتا ہے، کلام مجید میں اس کی صراحت نہیں کہ اس کا لقب کیا ہو، امام، خلیفہ، امیر المومنین، بادشاہ، صدر یا وزیر اعظم، یہ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے، اس کا یہ بھی حکم ہے کہ جو زمین پھیلائی گئی ہے، اور جو پہاڑ جمائے گئے ہیں اور جو نباتات اُگائے گئے ہیں اس سے معیشت کے اسباب فراہم کئے جائیں، اور یہ معیشت سب کے لئے ہو، اس طرح معیشت سنوارنے میں ویلفیر اسٹیٹ کا تخیل پیش کیا گیا ہے، نجی جائداد کی ممانعت نہیں کی گئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ باطل طریقہ سے حاصل نہ کی جائے، ظلم اور زیادتی سے دولت جمع کرنے والوں کو آگ میں جھونک دینے کی دھمکی دی گئی ہے، نجی جائداد کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی رہے، ورنہ یہ ناجائز ہے، یہ تقسیم سرمایہ داری کی روک کے لئے ہے، اور اسی روک کی خاطر یہ بھی حکم الٰہی ہے کہ جو مال جمع کیا جائے، وہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ میں خرچ کیا جائے، تاکہ یہ مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے، اسی لئے زکوٰۃ کو لازمی قرار دیا گیا ہے، صدقات کرنے کی بھی تلقین ہے، جو فقیروں اور مسکینوں کے علاوہ قرضداروں کی مدد کے لئے بھی ہیں، جنگ و صلح کے بھی باضابطہ احکام ہیں، ان لوگوں سے دوستی نہ کی جائے جنھوں نے مسلمانوں سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، یا ان کو گھروں سے نکال دیا، یا ان کے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی، ایسے ظالموں سے جنگ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، مگر اس کی بھی ہدایت ہے کہ جنگ کرنے میں

بے اعتدالی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کھیتوں کی غارت گری اور نسل انسانی کی تباہی کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو ان سے صلح کرلی جائے، لیکن وہ فریب اور دغابازی سے صلح کی خلاف ورزی کریں تو ان کی ایسی خبر لی جائے کہ دوسروں کے حواس باختہ ہوجائیں؛ قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی گئی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں ان احکام کی پابندی کی، آپ رحمۃ للعالمین تھے، آپ نے فرمایا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، آپ نے یہ بھی فرمایا، تمھارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور وہ تم سے محبت کریں، اور جن کے لئے تم دعا کرو اور وہ تمھارے لئے دعا کریں، اور بدترین حاکم وہ ہیں، جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، اور لعنت کرو تم ان پر اور وہ لعنت کریں تم پر، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بیت المال لوگوں کا ہے، حاکم وقت کا نہیں، وہ صرف اپنے ضروری اخراجات کے لئے اس سے کچھ رقم لے سکتا ہے، جزیہ ادا کرنے کے بعد آپ نے غیر مسلموں کو یہ حقوق دیئے کہ ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کا مال، ان کے قافلے، ان کی عورتیں، اللہ کی امان اور اس کے رسول کی ضمانت میں ہیں، ان کے حقوق میں دست اندازی نہ کی جائے گی، ان سے کوئی قومی خدمت نہ لی جائے گی، ان پر عشر نہ لگایا جائے گا، اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی الخ الخ، پھر آپ نے اپنی زندگی میں سچائی، عفت، پاکبازی، دیانت داری، رحم، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، عفو و درگذر، حلم و بردباری، تواضع و خاکساری، اعتدال، میانہ روی، سخاوت، حق گوئی، ایثار اور استغنا وغیرہ کے جو نمونے پیش کئے، وہی آپ کی حکمرانی کے بھی اصول بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کی کوئی خاص ہدایت نہیں

دی، شاید اس لئے کہ لوگ اپنی خواہش اور حالات کے مطابق یہ انتخاب کرلیا کریں، اس لئے خلفاء راشدین رض کے طرز انتخاب میں یکسانیت نہیں رہی، حالات کے تقاضے کے مطابق بدلتا رہا، حضرت ابوبکر صدیق رض کے ہاتھ پر حضرت عمر فاروق رض نے بڑھ کر بیعت کی، تو تمام لوگوں نے بیعت کرلی، حضرت ابوبکر صدیق رض نے حضرت عمر فاروق رض کو اپنا جانشین نامزد کیا، تو یہی نامزدگی برقرار رہی، حضرت عمر فاروق رض نے چھ صحابہ کرام کی ایک مجلس بنا دی کہ وہ ان کے جانشین کا انتخاب کریں، جس کے بعد حضرت عثمان غنی رض کا انتخاب ہوا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتخاب میں تو غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی، خلفائے راشدین رض کی حکومت کی نوعیت کیا رہی، اس کے مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، وہ موجودہ طرز کی جمہوریت تو نہ تھی، کیونکہ وہ لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین کے بجائے قرآن مجید اور حدیث کے احکام کے پابند رہے، مگر یہ تھیوکریسی بھی نہ تھی کیونکہ اس میں چرچ کی طرف سے حکومت ہوتی ہے، اسلام میں کوئی چرچ نہیں، خلیفہ کا انتخاب تو زندگی بھر کے لئے ہوتا، اس طرح یہ بادشاہت کی بھی ایک قسم تھی، وہ معزول بھی نہیں کئے جاسکتے تھے، اس طرح رائے عامہ سے بے نیاز بھی رہ سکتے تھے، امت کے مشوروں کو ماننے پر قطعاً مجبور نہ تھے، بلکہ ان کی اطاعت امت پر واجب تھی اس طرح وہ ڈکٹیٹر بھی تھے، مگر وہ لوگوں کے مفاد اور فلاح کے خواہاں اور کوشاں بھی رہے، اس لئے بعض لوگوں کے خیال میں ان کی حکومت اسلامی سوشلزم کے طرز کی تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جمہوریت، تھیوکریسی، بادشاہت، آمریت، اور سوشلزم کی تمام خوبیوں سے معمور رہی اور ان کی تمام برائیوں سے پاک تھی، اسلئے یہ بہترین حکومت قرار دی گئی، مگر ان کے بعد پھر ویسی حکومت نہ بن سکی، خاندانی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، کیوں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتخاب میں جو صورت حال پیدا ہوئی، یا یزید کی نامزدگی کے بعد کربلا کا جو سانحہ پیش آیا، تو اس کے بعد کیا لوگ یہ سمجھے کہ انتخاب

کے ذریعہ سے حکومت کا سربراہ مقرر کرنا آسان نہیں، وہ خاندانی حکومت کی نامزدگی کو قبول
کرنے کے لئے آمادہ یا مجبور ہوگئے، پھر قرآن مجید میں جمہوریت کا ذکر بھی کہیں نہیں آیا ہے بادشاہت
کا ذکر تو بار بار آیا ہے، خود اللہ تعالیٰ ذاتِ اپنے کو مَلِکِ النَّاس کہا ہے، اس نے خود طالوت کو اسرائیلیوں
کا بادشاہ مقرر کیا، اس کے حکم سے حضرت داؤدؑ یہودیوں کے بادشاہ بنے، اور اسی کے حکم سے حضرت داؤدؑ
کے فرزند حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے، یہ تو خاندانی وراثت تھی انبیاء میں بھی تو خاندانی وراثت ملتی
ہے، حضرت ابراہیمؑ ہی کے خاندان سے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے بعد
دیگرے نبی ہوئے، حضرت زکریا کے بعد آپ کے بیٹے حضرت یحییٰ کو نبوت ملی، اس لئے بادشاہت یا
خاندانی وراثت کوئی ایسی چیز نہیں جس سے ابا کیا جائے مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ خلافت تیس۳۰ سال رہے گی، پھر یہ خلافت بادشاہت ہوجائیگی،
مشکوٰۃ شریف ہی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ
ہوتا ہے، اور خدا کے بندوں میں سے ہر مظلوم بندہ اس کے یہاں پناہ حاصل کرتا ہے، پھر جب
وہ عدل و انصاف کرتا ہے تو اس کو ثواب ملتا ہے، اور رعیت پر اس کا شکر واجب ہوتا ہے، اور
جب ظلم کرتا ہے تو اس پر گناہ ہوتا ہے، ان حدیثوں کو ضعیف کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا، احادیث
میں بادشاہ اور بادشاہت کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر بار بار آیا ہے، اس
سے ظاہر ہے کہ آپ بادشاہت کو کوئی ناجائز طرزِ حکومت نہیں سمجھے۔

خلافت راشدہ کے بعد جو خاندانی حکومتیں قائم ہوتی رہیں، وہ خلافت راشدہ کی طرح معیاری
تو نہیں کہی جاسکتی ہیں، مگر کیا وہ غیر اسلامی تھیں اگر ہم ان کو غیر اسلامی قرار دیں تو ہماری سیاسی
تاریخ کیا رہ جاتی ہے، وہ تو ہماری تاریخ کا جز بن چکی ہیں، ان کو اپنے سیاسی جسم کا بدگوشت قرار
نہیں دے سکتے، ان ہی سے ہمارے زریں اور روشن کارنامے وابستہ ہیں، پھر اس حیثیت سے بھی غور

کرتا ہے کہ جو بھی خاندانی حکمراں ہوا، اس نے اپنی حکومت کے لئے لوگوں سے بیعت ضرور حاصل کی،
اس کا طریقہ جیسا بھی رہا ہو، یہ بیعت ریاست کے ملکی اور فوجی اعلیٰ عہدیداروں سے لی جاتی، جو
عوام کی بھی بیعت سمجھی جاتی، اس کے بغیر ایک حکمراں کی حکومت قانونی نہیں سمجھی جاتی، وہ بیعت
کے وقت پابند ہوجاتا کہ اس کی حکومت قرآن اور سنت کے مطابق ہوگی، اگر عوام اس کے خلاف
بغاوت نہ کرتے تو یہ سمجھا جاتا کہ اس کی حکومت ان کی خواہش اور رضامندی کے مطابق ہے، بعض
حکمراں کی نجی زندگی ضرور خراب رہی، مگر انھوں نے بھی اپنی حکومت کے کاروبار میں قرآن وسنت
کی بالادستی کو قائم رکھا، اور گو بعض اوقات بیت المال سے بے جا اخراجات بھی ہوتے رہے،
مگر اس کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لوگوں کی فلاح وبہبود اور حکومت کے بقا و استحکام میں
خرچ ہوتا رہا، اس لئے عوام میں بے اطمینانی نہیں رہی اور وہ ان حکمرانوں کو اسلام
اور مسلمانوں کی عزت وناموس کا نگہبان سمجھتے رہے، کوئی حکمراں شوریٰ سے بے نیاز بھی نہیں
رہا، وزراء مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتے، جن کے مشورہ کی پابندی اور قدر ہوتی رہی،
بعض حکمراں تو بہت ہی پرہیزگار، عبادت گذار اور متقی ہوئے، جن پر فخر کیا جاسکتا ہے، انھوں
نے اسلامی روایات کے وقار کو بڑھانے میں پوری کوشش کی، گذشتہ زمانے میں بادشاہت
ہی ہر ملک اور ہر قوم میں مقبول رہی، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنے سیاسی معاشرہ میں بادشاہت
کو قبول کر لیا، اب مذاق بدل گیا ہے، جمہوریت پسند کی جاتی ہے، اس لئے بادشاہت کی مقبولیت
ختم ہورہی ہے، مگر اس کے مقبول نہ ہونے کی یہ وجہ بتانا صحیح نہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے، بلکہ اس
کی وجہ یہ ہے کہ اب لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، اس لئے یہ قابل قبول نہیں، جب تک اس
کو پسند کرتے رہے یہ قابل قبول رہی، مگر جہاں قرآن پاک اور حدیث کی بالادستی ہو، وہاں
اگر بادشاہت بھی ہو تو وہ قابل قبول ہے، اور جہاں جمہوریت ہو مگر وہاں اللہ اور اس کے رسول

کے احکام نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، تو ایسی جمہوریت مسلمانوں کے لئے لعنت ہے، اصل چیز قرآن اور سنت کی بالادستی ہے، اس کے نفاذ کے لئے حکومت جیسی بھی ہو، وہ قابل قبول ہے، اسلامی ممالک کے عام مسلمان فرنگی جمہوریت نہیں، بلکہ اسلامی جمہوریت چاہتے ہیں، جس میں قرآن وسنت کے احکام کی کارفرمائی ہو، اور جس کے سربراہ اور اس کے عمال کے قول وفعل میں تضاد نہ ہو، کوئی سیاسی عیاری نہ ہو، آمریت نہ ہو، بلکہ ایسی حکومت ہو، جس میں حضرت فاروق اعظمؓ کا اسوۂ حسنہ ممکن العمل نہ ہو تو کم از کم اس کے سربراہ اور اس کے معاونین صاحبِ تقویٰ ضرور ہوں، میرے استاذ المکرم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا خیال ہے کہ

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی حکومت ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی، اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعین، ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اور ان کے عمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی وایمانی احساس ہے" (سیرۃ النبی جلد ہفتم ص ۱۹۱)

یہ خاکسار ڈاکٹر کلیم صدیقی کا ممنون ہے کہ جب میرا مقالہ شروع ہونے والا تھا تو انھوں نے سامعین سے اس کا اور دار المصنفین کا تعارف بہت اچھے الفاظ میں کرایا، اس نشست میں اس روز کے جتنے مقالہ نگار تھے، اسٹیج پر ایک ساتھ بٹھائے گئے، تاکہ حاضرین ان کے مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور مقالہ نگار جواب دیں، کچھ سوالات کے جوابات تو مقالہ نگاروں نے دیئے، مگر پروفیسر محمود ایوب کچھ ایسے چھائے رہے کہ وہی ہر سوال کا جواب دے کر

حاضرین کو مطمئن کر دیتے، میں نے ان سے خود یہ سوال کیا کہ کیا صحیح نہیں ہے کہ اسلام میں حکمرانی کے تمام اصولوں کی تو پورے طور پر وضاحت کر دی گئی ہے، لیکن حکومت کی نوعیت متعین نہیں کی گئی ہے، جغرافیائی حالات اور سیاسی مصالح کے تقاضے کی بنا پر لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جیسی حکومت چاہیں بنالیں، اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اس کا جواب مختصر طریقے پر نہیں دیا جا سکتا ہے، اس پر لمبی بحث ہو سکتی ہے، میں ان کے بغل میں بیٹھا تھا، وہ چپکے سے بولے کہ اس بحث پر زیادہ زور نہ دیا جائے، ہم دونوں نجی طور پر تبادلۂ خیالات کر لیں گے، مگر اس کی نوبت نہیں آئی، ڈاکٹر کلیم صدیقی کو انگریزی بولنے اور مجمع کو قابو رکھنے کی بڑی صلاحیت ہے، وہ کارروائی کو آگے بڑھانے اور روکنے میں بڑی مہارت دکھاتے رہے،

۴ر اگست کی نشست | ۴ر اگست کو دوسرا اجلاس دس بجے پھر شروع ہوا، پہلے روز کی طرح ہال بھرا ہوا تھا، اس روز یہ مقالے پڑھے گئے (۱) اسلامی سیاست کے مخصوص پہلو، از آیت اللہ جوادی الآملی (ایران) (۲) قرآن میں پارٹیوں کا تصور از ڈاکٹر احمد (قرہ وین یونیورسٹی) (۳) ربانی حکومت اور طاغوتی ریاستوں کی سیاست کا موازنہ از حجۃ الاسلام معاذی خواہ (طہران) (۴) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق وفرائض از ڈاکٹر عبدالرحمٰن دوئی (احمد بیلو یونیورسٹی نائجیریا) (۵) اسلام میں عدل کا تصور از پروفیسر ہشام عبدالرحمٰن (رباط یونیورسٹی)

اس دن کے سہ پہر کی نشست میں یہ مقالے پڑھے گئے (۱) اسلام اور اقتدار اعلیٰ: شیعہ کے اہم فقہاء کے خیالات میں فقیہ کی تولیت از ڈاکٹر فرہنگ رجبی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) (۲) اسلام میں امامت از ڈاکٹر حسن حبیبی (ایران) اسی نشست میں طہران یونیورسٹی کے پروفیسر

ڈاکٹر ابوالفضل غزنی اور سوڈان کے ڈاکٹر الطیب زین العابدین کے بھی مقالے تھے، پہلے روز کی طرح تمام مقالہ نگار اسٹیج پر بلائے گئے، ان سے مقالات پر بحث شروع ہوئی، مجھکو ذاتی طور پر ڈاکٹر عبدالرحمن دوئی کے مقالہ سے دلچسپی ہوئی، ان سے سوال کیا کہ آپ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں اول درجہ کا شہری تسلیم کرنے کے حق میں ہیں کہ نہیں، کیا وہ دوسرے درجہ کے شہری قرار دیئے جانے کے لائق ہیں، میں ہندوستان سے آتا ہوں، اگر ہندوستانی حکومت ہم مسلمانوں کو بھی دوسرے درجہ کا شہری قرار دے، تو کیا اسلامی ممالک کے مسلمان خوش اور مطمئن ہوسکیں گے، میرے اس سوال پر مجمع میں ایک کھلبلی سی پیدا ہوگئی، ایک طرف سے آواز اٹھی کہ اس مسئلہ کی وضاحت یہاں کی جائے، ڈاکٹر کلیم صدیقی کو میرے اس سوال کی نزاکت کا احساس تھا، انھوں نے اس پر بحث یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی کہ ہم یہاں اسلامی ریاست کی سیاست پر بحث کر رہے ہیں، غیر اسلامی ریاست میں کیا ہو اور کیا نہ ہو، وہ ہمارا موضوع نہیں، پروفیسر محمود ایوب کھڑے ہوکر بولے کہ اس وقت دنیا میں اسلامی ریاست کہاں ہے، جس کے مسئلے زیر بحث آئیں، ڈاکٹر عبدالرحمن دوئی نے جواب دینے کی کوشش کی، مگر ڈاکٹر کلیم صدیقی نے ان کو روک دیا، وہ اسٹیج پر سے اتر کر میرے پاس آئے اور بولے کہ یہ بہت عمدہ اور اہم سوال تھا، اس پر بحث ہونی چاہیے تھی، دوسرے دن ایک صاحب ہال میں میری سیٹ کے پاس آکر کہنے لگے، کہ اس مسئلہ کو پھر اٹھایا جائے، میں نے ان سے کہا کہ اب آپ اٹھائیں، میں اپنا احتجاج کرچکا۔

ایک ہوٹل میں کھانا اسی روز عزیزی محمد فاتح اپنے لڑکے محمد علی کے ساتھ ملنے کے لئے آئے، ان کا اصرار ہوا کہ کسی ہندوستانی ہوٹل میں جاکر کھانا کھائیں، آگرہ ریسٹورانٹ نامی ہوٹل لے گئے، یہاں ہندوستانی کھانے ملتے ہیں جس کے

کھانے کے لئے زیادہ تر انگریز مرد اور عورتیں تھیں، وہ پلاؤ، قورمے اور کباب شوق سے کھا رہی تھیں، ان کے کھانے کے ساتھ شراب بھی تھی، ان میں ہر ایک کو بڑی مقدار میں شراب پیتے دیکھا، ہم تین آدمیوں نے چپاتی، بریانی، قورما اور کباب کھائے، ان کا بل چودہ پونڈ ہوا، یعنی ہندوستانی سکے سے تقریباً ۲۵۰ روپے ہوئے، مجھکو یہ گراں گذرا،

۵ راگست کی نشستیں ۵ راگست کی دونوں نشستوں کے مقالے یہ تھے (۱) المہدی ابن تومرت (المتوفی ۵۲۶ھ) کے انقلابی تجربے کے مطابق ایک ریاست کی تاسیس از ڈاکٹر عبدالماجد نجار (ٹیونس) (۲) ہوسا لینڈ میں انیسویں صدی میں جہاد کے رہنماؤں کے سیاسی تصورات میں تغیرات از ڈاکٹر احمد محمد کانی (نائجیریا) (۳) شہید حسن البناء کے سیاسی خیالات از جبر رزق جبر (مصر) (۴) حال اور ماضی کے اسلامی انقلابات کا تخیلاتی اور عملی پہلو از مولانا محمد سلیمان طاہر (پاکستان) (۵) مولانا مودودی کے سیاسی افکار از جناب سید اسعد گیلانی (پاکستان) ڈاکٹر عبداللہ گل (ترکی) اور ڈاکٹر عارف ارسوئی (ترکی) کے بھی مقالے تھے، جب ان مقالات سے متعلق سوالات کئے جانے لگے تو مجھکو جناب سید اسعد گیلانی کے مقالے کے اس پہلو سے دلچسپی ہوئی جس میں انھوں نے ملوکیت پر تنقیدیں کی تھیں، میں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت داؤدؑ نے بادشاہت قائم کی اور ان کے لڑکے جانشین ان کے حضرت سلیمانؑ ہوئے، یہ تو بادشاہت اور خاندانی بادشاہت ہی تھی، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہ ربانی بادشاہت تھی جو ملوکیت سے مختلف تھی، میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ مولانا مودودی موجودہ طرز کی جمہوریت کے قائل نہ تھے۔ وہ خلافت راشدہ کو تھیوڈیموکریسی کہتے ہیں، اگر تھیوڈیموکریسی قائم ہو تو اس کے جمہوری انتخاب کی نوعیت کیا ہوگی، انھوں نے اس کا مختصر جواب

یہ دیا کہ عوام کی اکثریت کی رائے کا لحاظ تو رکھنا ہوگا، انھوں نے ایک نجی مجلس میں یہ بتایا کہ
پاکستان میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو مجلس شوریٰ قائم ہو، اس کے اراکین کے کردار کے لئے
کچھ شرطیں رکھی جائیں، یعنی وہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہوں، پرہیزگار ہوں، مخلص ہوں وغیرہ
وغیرہ، اور پھر رائے کسی فرد کے بجائے اس پارٹی کو دی جائے، جس کا وہ نمائندہ ہو، اس طرح
اچھے اراکین منتخب ہو سکیں گے، اور فضول قسم کی پارٹیاں نہ بن سکیں گی، جو خواہ مخواہ عوام کی رائے
کو تقسیم کر دیتی ہیں، اور برے افراد کو منتخب ہو جانے میں آسانی ہو جاتی ہے،

نجی ملاقاتیں حسن اتفاق ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے لائق مدرس مولانا برہان الدین
سنبھلی الجیریا کسی سیمینار میں گئے تھے، واپسی میں لندن بھی اتر گئے، وہ مولانا منظور احمد نعمانی
کے بڑے صاجزادے مولانا عتیق سنبھلی کے ساتھ ملنے کے لئے آئے، ہم لوگ لندن یونیورسٹی
کے ہوسٹل کے ایک ہال میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، تو ایسا معلوم ہوا کہ ندوہ کے مہمانخانہ
میں باتیں ہو رہی ہیں، اس ملاقات میں مولوی تقی امینی بھی شریک رہے، جن سے دونوں
حضرات بڑی عزت سے ملے، مولانا عتیق سنبھلی کا قیام لندن ہی میں رہتا ہے، وہ ہم لوگوں کو اپنے
گھر پر مدعو بھی کر گئے، اسی روز رات کو جناب مسرور احمد بھی پھر ملنے آئے، جس کے لئے ان کا
ممنون ہوا،

مقالوں کی نشستیں ۷ راگست کو مقالہ خوانی کی صرف ایک نشست ہوئی، اس میں صرف
دو مقالے پڑھے گئے (۱) اسلام کے سیاسی خیالات پر مغرب کے اثرات از پروفیسر محمود ضیا
(ڈکار) (۲) دولت عثمانیہ کا زوال اور عرب قومیت کی ابتدا از ڈاکٹر سید فہمی شہناوی
مقالہ نگاروں کی اکثریت ایسی تھی جو کسی نہ کسی حیثیت سے امام خمینی اور ایرانی انقلاب
کا ذکر ضرور لے آتی، اور ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب اور امام خمینی کو مسلمانوں کا نجات دہندہ

قرار دیتی، ایک صاحب نے خلافت کے احیاء کی طرف توجہ دلائی، مگر یہ آواز گونج کر رہ گئی،
افغانستان کے ایک نمایندہ نے روسیوں کے خلاف اپنے جہاد کا ذکر پُرزور طریقہ پر کیا، اور
یہ شکایت کی کہ ان کی ہمدردی میں اب تک کوئی بات نہیں کی گئی ہے۔
آخر میں ڈاکٹر کلیم صدیقی نے یہ اعلان کیا کہ اس سیمینار کی ڈرافٹ کمیٹی نے جو
سفارشات مرتب کی ہیں وہ سُن لی جائیں۔

بنیادی تصورات (۱) اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اگر کوئی مسلم ریاست
کسی ایسی طاقت یا سیاسی تفکر کے ماتحت ہو جاتی ہے، جو غیر اسلامی ہے، تو وہ اللہ کی
باغی ہے (۲) دین اور سیاست میں ناقابلِ تقسیم اتحاد ہے، اگر دین اور سیاست کو علیحدہ
کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ امہ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا (۳) اسلام اور کفر کے
سیاسی رول تاریخ کے دو متضاد رجحانات ہیں، ان دونوں میں کسی قسم کا اشتراک نہیں ہے،
(۴) مغربی جمہوریت میں سیاسی پارٹی کا فریم ورک سوسائٹی میں انتشار پیدا کرتا ہے، اس
لئے یہ امہ کے لئے بالکل مناسب نہیں (۴) جہاد ہر مسلمان کے لئے ہر وقت لازم ہے،
اور ہر موجودہ اسلامی تحریک کا لازمی جزو ہونا چاہیئے۔

ان سفارشات میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل قبول نہ ہو، البتہ کفر اور جہاد
جیسے الفاظ کو مسلمان مورخین گذشتہ زمانہ میں برابر استعمال کرتے رہے ہیں، کفر کے
خلاف جہاد ہوا یا نہیں، اس پر بحث کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ غیر مسلموں
کے لئے اشتعال انگیز رہے، اور جب انھوں نے مسلمانوں پر استیلا پایا تو کفر اور جہاد
کا پورا بدلہ لیا، سفارشات میں کفر کے بجائے غیر اسلامی نظام استعمال کیا جا سکتا تھا،
اس لئے جی چاہا کہ اس کی طرف توجہ دلائی جائے، لیکن جو جوش و خروش اُمڈا ہوا تھا، اس میں

اس قسم کی باتوں کی طرف توجہ دلانے کی گنجائش نہ تھی۔

اس کے بعد ایک علٰحدہ عنوان سے امہ کے یہ سیاسی مقاصد متعین کئے گئے:

(۱) اللہ اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں ہر حکم اور اقتدار کا استیصال کیا جائے،
(۲) نیشنلزم (قومیت) کے ہر تصور اور شکل کو رد کرکے اس کو ختم کیا جائے،
(۳) تمام اسلامی تحریکوں کو ایک عالمگیر اسلامی تحریک سے متحد کرکے
اسلامی ریاست قائم کی جائے (۴) دنیائے اسلام کو اسلامی ریاستوں کے نظام
میں سے منسلک کرنے کے لئے ایسے ادارے قائم کئے جائیں جن سے امہ میں اتحاد
پیدا ہو (۵) مغربی تمدن کے جو سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری
اثرات دنیائے اسلام میں داخل ہوگئے ہیں وہ ختم کئے جائیں (۶) اسلامی تمدن کو عالمگیر بناکر
ہر جگہ پھیلایا جائے، اس کی بنیاد توحید کے تصور پر ہو (۷) ایسے ادارے قائم کئے جائیں
جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ترویج کریں (۸) انسانی تعلقات کے لئے دنیا
میں عدل قائم کیا جائے۔

یہ کتنی اچھی تجویزیں ہیں، اگر ہر جگہ ان پر عمل کیا جائے تو اسلام کے قرونِ اولیٰ کی
یاد تازہ ہو جائے اور مسلمان دنیا میں باوقار اور جاندار امہ کی حیثیت سے دنیا
پر چھا جائیں۔

پھر یہ سفارشیں منظور کی گئیں:۔

(۱) یہ سیمنار اس کی سفارش کرتا ہے کہ (الف) علماء اور مسلمان دانشوروں کا
ایک آزاد فورم قائم کیا جائے جو دنیا کے تمام حصوں میں اسلامی تحریکوں سے تعاون
کرکے ان کی صحیح رہنمائی کرے (ب) مسلم انسٹیٹوٹ ایک ایسا لائحۂ عمل تیار کرے

جس سے اس سفارش کے پہلے جز پر عمل ہو، یہ لائحۂ عمل ہر جگہ تقسیم کرکے زیر بحث
لایا جائے (ج) مسلم انسٹیٹوٹ ایک ایسے جرنل کا اجرا کرے جس میں مسلمانوں کے
سیاسی خیال کا تجزیہ ہوتا رہے (۲) (الف) اسلامی جماعتیں اور تحریکیں ایران کی
اسلامی ریاست سے تعلقات پیدا کریں اور اس اسلامی انقلاب کے تجربات
سے فائدہ اٹھائیں (ب) ایران کی اسلامی ریاست بھی اسلامی جماعتوں اور
تحریکوں سے تعلق پیدا کرکے ان سے تعاون کرے (۳) اسلامی جماعتیں
اور تحریکیں دستوری اصلاحات کے طریقۂ کار کو ختم کریں اور اسلامی ریاستوں
کے قیام کے لئے جد وجہد کریں (۴) اسلام کے علماء اور دانشور معذرت خواہ
بننے کے رجحانات ختم کریں اور اسلام کے اوریجنل ماخذوں سے مسلمانوں کے
سیاسی خیالات کے ایک مبسوط نظام کے نشوونما کی کوشش کریں (۵)
اسلام کے علماء ہی کے ذریعہ سے اسلامی تحریکوں کی متقیانہ قیادت پیدا ہوسکتی ہے
وہ آگے بڑھ کر امہ کی رہنمائی کریں (۶) فلسطین کا مسئلہ صرف فلسطینیوں اور
عربوں ہی کا نہیں، یہ اسلام کا عالمگیر مسئلہ ہے، جس کے لئے امہ کی رائے عامہ کو
ہموار کیا جائے (۷) جو مسلمان اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشاں ہیں، وہ
قابل تعریف ہیں، افغانستان کے مسلمانوں کا جہاد قابل تحسین ہے، اور دنیا کے تمام
مسلمان ان کی جد وجہد کی تائید کریں (۸) عربی اسلام کی بین الاقوامی زبان ہونی چاہئے
اور تمام مسلمان اس کو سیکھیں۔

یہ کیسے اچھے اور اعلیٰ مقاصد ہیں، خدا کرے یہ تمام مسلمانوں کے دلوں میں
اتر جائیں، ایسی آوازیں تو ہر زمانہ میں بلند ہوتی رہیں، مگر اس پر عمل نہ ہوسکا،

مگر اب جب کہ عام مسلمانوں میں خود ایسے جذبات پیدا ہو رہے ہیں تو شاید ایسی آواز موثر ثابت ہو،

وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مغرب کے سیاسی، تمدنی اور فکری ملمع سازی سے بیزار ہو چکے ہیں، وہ اب ایک ایسا نظام چاہتے ہیں، جو ان کو صحیح معنوں میں ذہنی اور نفسیاتی سکون عطا کر سکے، وہ سیاست میں فریب کاری بھی نہیں چاہتے نیشنلزم کے نام سے بھی وہ برگشتہ ہو چکے ہیں، مذہب کو چھوڑ کر جو سیاست چلائی گئی ہے اسکے نتیجے بھی وہ دیکھ چکے، وہ تجدید اور احیاء کے لئے بے چین ہیں، ایران کے انقلاب کی طرف ان کی نظریں اسی لئے اٹھی ہیں کہ جو چیز ان سے چھین لی گئی تھی، وہ شاید اس کے ذریعہ سے حاصل ہو جائے، اور اگر اس کی طرف نظر اٹھ کر ان کا دل دھڑکتا ہے تو اسلئے کہ کہیں اس کے ذریعہ سے ان کی امیدیں پوری نہ ہوں، اوپر جو مسلمانوں کے بنیادی تصورات یا سفارشیں یا مقاصد متعین کئے گئے ہیں، وہ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز ہے، مگر ان کی تکمیل تو اسی وقت ممکن ہے، جب تمام مسلم ممالک سے بھی ایسی ہی آوازیں اٹھیں، اگر مسلمان ممالک کے سربراہوں کی سمٹ کانفرنس کی طرف سے یہ آواز اٹھتی تو یہ کیسی موثر اور جاندار ہوتی، یہ کہیں سیمینار کی رسمی آواز بن کر فضا میں گونج کر نہ رہ جائے، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمان ممالک کو بھی اعتماد میں لیا جائے اور اس وقت وہاں کی حکومتوں کی نوعیت کچھ بھی ہو اور ان کے حکمران جیسے بھی ہوں، مقاصد کی تکمیل کے لئے ان ہی سے تعاون کر کے فضا ہموار کی جاسکتی ہے، ان کے ہمنوا بنانے میں تدبر، مآل اندیشی اور افہام و تفہیم کی ضرورت ہے، ان سے محاذ آرائی کسی لحاظ سے مناسب نہیں۔

سیاسی مقاصد کے متعین کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ تمام اسلامی تحریکوں کو ایک عالمگیر اسلامی تحریک سے متحد کر کے اسلامی ریاست قائم کی جائے، اگر اس سے یہ مراد ہے کہ نیشن اسٹیٹ کے بجائے مسلمانوں کے ہر ملک میں اسلامی اسٹیٹ ہو تو یہ ایک اچھی تجویز ہے، نیشن اسٹیٹ سے مسلمانوں کو جو نقصانات پہونچے ہیں یا پہونچ رہے ہیں، اس کی تاریخ بہت ہی المناک ہے، لیکن اگر اس سے یہ مراد ہے کہ تمام امہ کی ایک اسلامی ریاست ہو، تو یہ بات ذہن میں مشکل سے اترے گی، تاریخ میں مسلمانوں کو ایک کرنے کی تو مثالیں ملتی ہیں، بنو امیہ، بنو عباس اور دولت عثمانیہ کے حکمرانوں کی نیت کچھ بھی رہی ہو، مگر ان کے امپائر سے امہ کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی گئی، بنو امیہ کی یہ کوشش ۹۰ برس کے بعد ختم ہو گئی، بنو عباس نے یہ کوشش پانچسو برس سے زیادہ تک جاری رکھی، دولت عثمانیہ نے بھی یہ کوشش تقریباً ساڑھے پانچ سو برس تک کی، اگر اس قسم کی مثالوں کا اعادہ ہو جائے تو پھر امہ کی تاریخ زریں بن سکتی ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تینوں امپائر سے معلوم نہیں کتنی چھوٹی چھوٹی نیشن اسٹیٹ بنتی رہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے میں ان امپائر کے حکمرانوں کی سیاسی، اور فوجی قوتیں برابر ضائع ہوتی رہیں، پھر موجودہ دور میں جو طاغوتی طاقتیں دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، وہ امہ کو متحدہ قوت بننے دینگی بھی کہ نہیں، اور خود مسلمانوں کی موجودہ تقریباً ۴۴ ریاستیں ایک لڑی میں منسلک ہونا پسند بھی کریں گی کہ نہیں، اور اگر ہو بھی گئیں تو معلوم نہیں کیا کیا صبر آزما اور ناقابل حل مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، البتہ یہ بات مشکل نظر نہیں آتی کہ مسلمانوں کی یہ علٰحدہ علٰحدہ ریاستیں نیشن اسٹیٹ کے بجائے اسلامی اسٹیٹ بن کر رہیں، اور اسلامی اخوت و یگانگت کی خاطر کامن ویلتھ یا یو۔ این۔ او یا مسلمان سربراہوں کی سمٹ کانفرنس کے نمونے کی طرح کوئی اجتماعی تنظیم بنا کر ایک دوسرے سے منسلک

رہیں، اس کی راہ ہموار کرنے کے لئے ایک خاص پروگرام کی ضرورت ہے، جس کا مرتب ہونا تو آسان ہے، مگر تمام ممالک سے اس کا منوانا ضرور مشکل ہے، لیکن تدبر ہو، عزم ہو، اصابت رائے ہو، دلوں کی تسخیر کا جذبہ ہو، افہام وتفہیم ہو، مغرب کے سیاسی افکار وتصورات سے نجات ہو، قرآن اور حدیث کے احکام کی پابندی کی لگن ہو، فرقہ بندی کا خیال نہ ہو، اسلامی اخوت ذہن پر چھائی ہو تو کیا عجب کہ یہ اعجاز دیکھنے میں آجائے۔

ریجنٹ پارک کی مسجد میں نماز جمعہ

۵/اگست کی صبح کی نشست کے بعد ہم لوگوں کو ریجنٹ پارک کی بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے بس میں لے جایا گیا، یہ لندن کے قلب میں ہے، کافی بڑی ہے، نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، ہر ملک کے لوگ دکھائی دیئے، ایسا معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان ہی کی کسی بڑی مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں، اس کے ایک امام مصری بھی ہیں، وہ ریش وبروت سے عاری تھے، انھوں نے خطبۂ ثانی سے پہلے عربی اور پھر انگریزی میں وعظ کہا، نماز مختصر پڑھائی، یہاں نمازیوں کا ہجوم دیکھ کر طبیعت میں نشاط پیدا ہوا، بس میں خاص بات یہ دیکھی کہ اس میں ڈرائیور کے پاس وائرلیس لگا ہوا تھا، جو اپنے ہڈکوارٹر کو برابر خبر دیتا رہتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، راستہ بھول جاتا تو وہیں سے پوچھتا

سیمنار کی الوداعی نشست

الوداعی نشست میں لندن کے اور مسلمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، اس میں بولنے کے لئے جن چند نمایندوں کا انتخاب ہوا تھا، ان میں میرا نام بھی تھا، اسکی ابتدا برادرم ڈاکٹر سید سلمان ندوی کی تقریر سے ہوئی، جنھوں نے انگریزی میں ایک اچھی تقریر کی، افغانستان کے ایک نمایندہ نے روسیوں کے خلاف افغانیوں کے جہاد کی تفصیل بیان کی، آخر میں اللہ اکبر کے تین نعرے خود لگائے، اور حاضرین کو ساتھ دینے کو کہا، اور پھر یہ بتایا کہ روسی ان تکبیروں سے بہت خوف زدہ ہوجاتے ہیں، اور یہ گولہ باری سے زیادہ

کام کرتی ہیں، اس کے بعد ہر تقریر کے آخر میں حاضرین تالیاں بجانے کے بجائے اللہ اکبر ہی کی آواز بلند کرتے تھے، مصر کی ایک خاتون مسز صفی ناز کاظم نے مائک کے سامنے آکر ایک تحریری تقریر کی، اس میں عراق کے صدر صدام کی پرزور مذمت کی، انھوں نے ایران کے اسلامی انقلاب اور امام خمینی کو خراج عقیدت دل کھول کر پیش کیا، بنگلہ دیش کے پروفیسر انور حسین کی تقریر میں صرف امام خمینی کے محاسن کا ذکر تھا، پاکستان کے مولانا عبد الحلیم قاسمی اور مولانا سلیمان نے بھی امام خمینی کی تعریف کی، اس راقم کا نام پکارا گیا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا تقریر کروں، مگر مائک کے پاس کھڑا ہوا تو عرض کیا کہ لندن کے کسی پلیٹ فارم سے بولنا اس لئے آسان نہیں کہ یہاں کی فکر ونظر کی قوس وقزح کے سامنے کوئی اور رنگ پسند نہیں کیا جاسکتا، پھر عرض کیا کہ اسلامی انقلاب کے ذکر سے میرے خیالات کا ایک فردوس ضرور آباد ہوگیا ہے، مگر ہم ہندوستانی مسلمان اسلامی انقلاب کو سوچ نہیں سکتے، مگر ہاں ہم سچے اور اچھے مسلمان بن کر زندگی بسر کرنے کا عزم ضرور رکھتے ہیں، پھر ایک اچھے مسلمان ہونے کے کیا شرائط ہیں، ان کو بیان کیا، حضرت عمرؓ، حضرت سعیدؓ بن عامر اور حضرت ابوعبیدہ کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کئے، پھر ہندوستان میں جو اسلامی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی اور دار المصنفین کے ذریعہ جو کارنامے انجام پائے ہیں ان کی تفصیل بتائی، اور اسلام کس طرح ہندوستان کے لوگوں کے ذہن پر چھا رہا ہے، اس کے ذکر میں مسز اندرا گاندھی کی اس تقریر کا حوالہ دیا، جو انھوں نے حکومت ہند کی طرف سے پندرہویں صدی کے سیمنار کے موقع پر کی تھی اور کہا تھا کہ اسلام ہمارا مذہب ہے، ہم لوگ اسلام کے ان کارناموں کو نہیں بھول سکتے جو اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے آرٹ، ارکی ٹکچر، تہذیب اور تمدن میں نظر آتے ہیں، پھر اسی جشن میں سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس سوامی آئر کی اس

تقریر کا حوالہ دیا، جس میں انھوں نے کہا تھا کہ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی قوانین اور صرف اسلامی قوانین ہی دنیا کے بین الاقوامی قوانین بنائے جا سکتے ہیں، پھر عرض کیا، اسلام کے ذریعہ سے انسانیت کو جو پیار، چمکار اور للکار ملی ہے، ان کا ہم صحیح نمونہ پیش کریں تو نہ صرف ہم اپنی زندگی کو بہار آفریں اور عطر آگیں بنا سکتے ہیں، بلکہ دنیا خود اسلام کے گلے میں اپنی عقیدت کے معطر معطر پھولوں کا مرصع ہار پہنانے کے لئے آگے بڑھے، اور کیا عجب کہ اکیسویں صدی کا آغاز اسلام کی نکہت بیزی اور مشک آگیں سے ہو وغیرہ وغیرہ۔ میری تقریر ختم ہوئی تو ڈاکٹر کلیم نے سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مقرر کو انکسار سے کام لینے کی ضرورت نہ تھی، دارالمصنفین کی خدمات کا اعتراف ساری دنیا میں ہوا ہے۔

اس الوداعی جلسہ میں شیخ اسد تیمی نے اپنی خطابت سے حاضرین کو پھر محظوظ کیا، ایران کے آیت اللہ جواد الآملی اور لبنان کے شیخ محمد حسین فضل اللہ نے بھی تقریریں کیں، اور جلسہ جب خوشگوار فضا میں ختم ہوا تو لوگ جناب ڈاکٹر کلیم صدیقی کو اس کی کامیابی پر گلے مل مل کر مبارکباد دے رہے تھے۔

میری تقریر اور مقرروں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی، مگر جلسہ کے بعد حاضرین میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ کا یہ جملہ کہ "ہم ہندوستانی مسلمان اسلامی انقلاب سہہ بھی نہیں سکتے" تیر کی طرح کلیجے میں لگا، ایک اور صاحب نے کہا کہ ہندوستان کے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس کی رائے کو تو تمام دنیا میں پھیلانے کی ضرورت ہے، اچھا ہوا کہ آپ نے اس پلیٹ فارم سے دنیا کو یہ آواز سنا دی، ایک اور صاحب نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان یہی تقریر کر سکتا ہے، پھر ایک افغانی جوڑے نے کہا کہ ہم لوگ اردو سمجھتے ہیں، جس نرم اور میٹھے لب ولہجہ میں آپ نے ساری باتیں کہیں وہ تقریر کی جان تھی، ایسی میٹھی اردو یاد رہے گی، ایک اور صاحب نے کہا کہ علم مجسم علم متکلم ہو رہا تھا، یہ سن کر خوش ہونے کے بجائے شرمندہ ہوا

(باقی)

ادبیات

شاہنشہِ ولایتِ صبر و رضا حسینؓ

از، پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، مسند نشین و خادم حضرت خواجہ غریب نوازؒ، اجمیر شریف

وہ وارثِ فضائلِ خیر الوریٰ حسینؓ
وہ جان نثارِ دینِ رسولِ خدا حسینؓ

چشم و چراغِ کعبۂ توحید لا الٰہ
درِّ یتیم تاجِ شہِ انبیاء حسینؓ

آئینہ دارِ اُسوہ و خلقِ محمدیؐ
تصویرِ دل پذیرِ جمالِ خدا حسینؓ

تمکینِ عشق، نازشِ ایماں، پناہِ دیں
شاہنشہِ ولایتِ صبر و رضا حسینؓ

خوفِ عطش، ہلاکتِ اولاد و جان و مال
ہر امتحاں میں پورا اُترتا گیا حسینؓ

شرحِ جمیل مصحفِ ایمان و معرفت
فرہنگِ شاہ نامۂ عشقِ خدا حسینؓ

"تطہیر" کے معانی کا مصداق ارجمند
"والعصر" کے مطالبِ حق کی ادا حسینؓ

اسلام ناز کرتا ہے تجھ سے شہید پر
سر دے کے تو نے دین کو چمکا دیا حسینؓ

مردانِ حق زمانے کا رُخ پھیر دیتے ہیں
دنیا کے سرکشوں کو یہ بتلا گیا حسینؓ

کوثر بجام، خلد بداماں، نظر بحق
کس شانِ مصطفائی سے کوفے چلا حسینؓ

عُشاق، راہِ عشق میں کیا کچھ نہ کر گئے
پر کوئی کر سکا نہ، جو تو کر گیا حسینؓ

تنظیمِ کائناتِ محبت نہ ہو سکی
جب تک کتابِ دل پہ نہ لکھا گیا حسینؓ

اس کو بھی راہِ حق میں شہادت نصیب ہو
تیری ولا میں یہ ہے حسن کی دعا حسینؓ

مطبوعات جدیدہ

سیر المنازل :- مرتبہ، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۳۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۵ روپیہ۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مرزا سنگین بیگ نے سیر المنازل کے نام سے دلی کی ایک مختصر تاریخ انیسویں صدی کے اوائل میں لکھی تھی۔ اس فارسی کتاب میں مختلف حکمرانوں کے عہد میں بسائے گئے شہروں، محلوں، عمارتوں، مسجدوں اور مقبروں کا جغرافیہ، محل وقوع اور ان پر نصب شدہ کتبوں کی تفصیل درج کی ہے۔ اور قلعوں، حویلیوں، دروازوں، دہلی کے گلی کوچوں، مکانوں، بازاروں، باغوں، دوکانوں، تھانوں، پولیس چوکیوں اور غیر مسلموں کے معابد کا حال بھی بیان کیا ہے۔ اور یہاں کے باشندوں، اہل حرفہ، صنعت کاروں اور اصحاب علم و کمال کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس حیثیت سے یہ بڑی اہم کتاب ہے، مگر ابھی تک غیر مطبوعہ اور عام دسترس سے باہر تھی، اب دلی یونیورسٹی کے ایک لائق استاذ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے دلی میں موجود اس کے دو قلمی نسخوں کی مدد سے اس کا فارسی متن اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ابتدا میں فارسی متن اور آخر میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے، دونوں حصوں میں فاضل مرتب کے حواشی بھی ہیں۔ پہلے حصہ کے حاشیوں میں نسخوں کے فرق و اختلاف کی صراحت اور آیات قرآنی کے حوالوں کی تخریج کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں مصنف کے مجمل بیان کی وضاحت کے علاوہ مترجم نے بعض ضروری اور مفید باتوں کا اضافہ کیا ہے،

شروع میں مترجم و مرتب کے قلم سے ایک مفصل مقدمہ میں سیر المنازل کے متعلق ضروری اور اہم معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں اس کے زمانۂ تصنیف، قلمی نسخوں، اہم خصوصیات، موضوع اور خاص خاص مشمولات پر بحث کے علاوہ اس موضوع کی دوسری تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کا دعویٰ ہے کہ سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید کے مقابلہ میں سیر المنازل کی اہمیت زیادہ ہے، آخر میں اشخاص اور جگہوں کا مفصل انڈکس بھی دیا ہے، سیر المنازل کا متن و ترجمہ شائع کرکے ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے ایک مفید علمی و تحقیقی خدمت انجام دی ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عرب و دیار ہند :- مرتبہ، مولانا خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰۷، قیمت ۲۵ روپیے۔ پتہ (۱) دار السلام نوایت کالونی بھٹکل (۲) ایجنسی تاج کمپنی نمبر ۱۰ مسجد اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی محققانہ کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" سے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے نئے نئے گوشے سامنے آئے۔ اور اس کے بعد اس موضوع پر جو کام ہوا اس میں اس کتاب سے بڑی مدد لی گئی، اس نئی کتاب میں عرب و ہند کے تعلقات کے علاوہ جنوبی ہند کی ان قوموں کا تذکرہ بھی ہے۔ جو عرب کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی ہیں اور وہاں سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئیں۔ پہلے عرب و ہند کے تعلقات کی قدامت، ہندوستان میں عربوں کی آمد، قدیم مورخوں اور سیاحوں کی زبانی ہندوستان کے حالات، اور جنوبی ہند کے بارہ میں کتب تاریخ سے معلومات قلمبند کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں جنوبی ہند کے قدیم باشندوں ڈریویڈین اور وسط ایشیا سے آرین قوم کے یہاں آنے کا حال بیان کیا ہے، پھر ہندوستان سے اسلام کے تعلق کی ابتدا، اس پر مسلمانوں کے حملے اور عہد عباسیہ میں ہندوستان سے علمی، ثقافتی اور تمدنی تعلقات دکھائے ہیں، اور کئی جگہوں، سراندیپ، مالدیپ، ملیبار، کولم، کالی کٹ، معبر، دکار، دمنڈل، اور گجرات سے

مسلمانوں کے تعلق کا ذکر، اور اس سلسلہ کے بعض ضمنی واقعات اور قدیم راجاؤں وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، پھر غزنوی، غوری اور خلجی حملوں، گجرات میں خود مختار مسلم حکومت کے قیام اور مختلف حکمرانوں کا ذکر کرنے کے بعد دور تغلق، بہمنی سلطنت کے قیام اور اس زمانہ کے بعض ہندو راجاؤں، تلودا خاندان کے حکمرانوں اور ادار اویدو اخاندان کا حال لکھا ہے۔ اور آخر میں مغلوں کے دور کے جنوبی ہند کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں مرہٹوں کے اس پر قبضہ و غلبہ کی روداد بھی قلمبند کی ہے، کتاب کے دوسرے حصہ میں جنوبی ہند کی مشہور قوم نوایط کی مفصل تاریخ لکھی ہے۔ اس میں اس قوم کا عہد بعہد حال اور عربی النسل ہونا ثابت کیا ہے۔ اور اس کی ممتاز اور اہم علمی و دینی شخصیتوں، اولیاء و صلحاء، اہم خانوادوں، طریقت کے سلسلوں، حکام و امراء اور ان کی انتظامی قابلیت وغیرہ پر بحث کی ہے، اس سلسلہ میں جنوبی ہند کی بعض اور قوموں اسماعیلی بوہرے، خوجے اور میمن وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے برسوں کے مطالعہ کا نتیجہ اور گوناگوں معلومات پر مشتمل ہے، مگر مصنف کا تعلق جنوبی ہند کے ایسے علاقے سے ہے۔ جس کی اصل زبان اردو نہیں ہے۔ اس لئے اس میں زبان و بیان کی ناہمواری اور ترتیب کی خامی بھی ہے، اگر مصنف اسے ابواب و فصول پر مرتب کرتے اور ان کے تحت مختلف النوع معلومات قلمبند کرتے تو کتاب کے مباحث میں انتشار اور پراگندگی نہ پائی جاتی اور استفادہ کرنے والوں کو بھی سہولت ہوتی، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک مفید مقدمہ بھی ہے۔

جواہر الحدیث :- مرتبہ۔ جناب شمس پیرزادہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، قیمت۔ ساٹھ روپیے۔ پتہ ادارہ دعوۃ القرآن ۵۹، محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳ ...... ۴۰۰۰

منتخب احادیث کے مجموعے برابر مرتب کئے جاتے رہے ہیں، یہ نیا مجموعہ مولانا ابواللیث اصلاحی

امیر جماعت اسلامی ہند کی ہدایت کے مطابق غیر مسلموں کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور دعوتی پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں آپ کے اوصاف حمیدہ، خصائل مبارکہ اور اسلام کے صحیح تعارف پر مبنی حدیثوں کا انتخاب کیا گیا ہے، لائق مصنف نے مندرجہ ذیل گیارہ عنوانات کے تحت حدیثیں جمع کی ہیں۔ (۱) حیات طیبہ کی چند جھلکیاں (۲) تعمیر کردار (۳) بگاڑ پیدا کرنے والی باتیں (۴) سیاست و حکومت (۵) دنیا کی حیثیت (۶) شرک و بدعت (۷) توحید (۸) رسالت محمدیؐ (۹) قرآن (۱۰) زندگی بعد موت (۱۱) قبول اسلام کے واقعات، پہلے احادیث کا عربی متن درج کرکے ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کی مختصر تشریح کی گئی ہے، شروع میں رسول اکرمؐ کے حلیۂ مبارکہ، سیرت طیبہ اور اخلاق عالیہ نیز انسانی سیرت و کردار کو بنانے اور بگاڑنے والی چیزوں سے متعلق حدیثیں نقل کی گئی ہیں، اس کے بعد دوسری نوعیت کی حدیثیں دی گئی ہیں۔ جو نہایت موثر اور سبق آموز ہیں، ترجمہ سلیس عام فہم اور تشریح موثر اور دلنشین ہے۔ اس کتاب سے ہر استعداد کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر لائق مرتب احادیث میں وارد مشکل الفاظ کی علحدہ مختصر تشریح بھی کر دیتے تو اس کا فائدہ اور زیادہ ہو جاتا۔

امعان :- مرتبہ، ڈاکٹر محمد منصور عالم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تیس ۳۰ روپیے۔ پتہ (۱) دانش اکیڈمی، ملکی محلہ، آرہ (۲) کتاب منزل سبزی باغ، پٹنہ۔

یہ کتاب ڈاکٹر محمد منصور عالم کے دس ۱۰ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں مرزا افضل بیگ قاقشال کے ایک تذکرہ "تحفۃ الشعراء" کے متعلق ڈاکٹر حفیظ قتیل کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ وہ شعرائے ریختہ کا تذکرہ ہے، کیونکہ اس میں اردو و فارسی دونوں زبانوں کے شعرا کے تذکرے ہیں،

اس مضمون میں بعض اور باتیں بھی درج ہیں مگر یہ مختصر ہے۔ اور اس میں نہ تذکرہ کے مندرجات پر کوئی بحث کی گئی ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، ایک مضمون میں آگرہ سے شائع ہونے والے گلدستہ "دامن بہار" کے تین شماروں کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے، دو مضامین میں بہار کے دو مشہور شاعروں پرویز شاہدی اور قیس دانا پوری کی شاعری کی خصوصیات دکھائی ہیں، ایک طویل مضمون میں اختر اورینوی کے ادبی درجہ و مرتبہ کی تعیین کی گئی ہے، اس میں اورینوی صاحب کی انشا پردازی، تحقیق، تنقید، افسانہ، ناول اور ڈراما نگاری اور شاعری کا الگ الگ جائزہ لیکر تحقیق و تنقید میں ان کی کم مائیگی ثابت کی ہے، ایک مضمون میں شاد عظیم آبادی کے بارہ میں قاضی عبدالودود کی بعض توضیحات درج ہیں جن سے شاد کے بیان کی تردید مقصود ہے، ایک مضمون میں سہ ماہی معاصر کے قاضی عبدالودود نمبر پر تبصرہ ہے اس میں قاضی صاحب کی خود نوشت سوانحعمری کے اس حصہ پر خاص طور سے ردوکد کی ہے، جس میں انھوں نے مذہب، آخرت اور آسمانی کتابوں کے بارہ میں شک و شبہہ کا اظہار کیا ہے۔ مصنف کو جناب کلیم الدین احمد صاحب سے خاص عقیدت ہے اس لئے وہ دوسروں پر ان کی ہر تنقید کو روا، معروضی اور حق بجانب بتاتے ہیں، مگر ان پر دوسروں کی تنقید کو خردہ گیری، غیر مدلل، غیر متوازن اور سنجیدگی، گہرائی اور علمیت کے خلاف بتاتے ہیں، اس کا اندازہ اس مجموعہ کے دو مضامین "تنقید یا خردہ گیری" اور "حیات کلیم" سے ہوتا ہے، مصنف کے بعض خیالات محل نظر ہیں جیسے "اردو افسانہ نگاری میں پریم چند کے بعد ہماری توجہ کو سب سے زیادہ اختر اورینوی کھینچتے ہیں" (ص ۸۲)، کہیں کہیں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں۔ مصرف کا لفظ کئی جگہ غلط استعمال کیا ہے، مثلاً "وہ چھوٹا ناگپور کے قدرتی وسائل سے مصرف لے کر کئی قسم کے کاروبار شروع کر دیتا ہے" (ص ۹۰) "اختر اورینوی کے ذہن میں غیب سے مضامین نئے انوکھے اور دلکش مضامین

آتے رہتے ہیں"۔ (ص ۲۳و۲۴) خط کشیدہ "مضامین" زائد اور بلاضرورت ہے "نکالتا نہ" (ص ۲۵) کا لفظ نامانوس ہے۔ ایک جگہ مصنف نے اپنے ممدوح کلیم الدین صاحب کا یہ اقتباس نقل کیا ہے۔ "پھر یہ بھی ہے۔ Stamasis. مرضیات کی ایک اصطلاح ہے" (ص ۱۱۱) مرض سے مرضیات بنا لینے کا حق کلیم صاحب ہی کو ہے کیونکہ ان کے عقیدتمندوں کے نزدیک مستند ہے ان کا فرمایا ہوا، ورنہ عام لوگ تو اسے مرضی کی جمع سمجھتے ہیں۔ ان خامیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہ مضامین اچھے اور مصنف کی بہتر صلاحیت کے غماز ہیں۔

ملا جیونؒ کے معاصر علماء: مرتبہ۔ جناب اشفاق علی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت۔ بیس روپے (۲۰)۔ پتہ جناب اشفاق علی ۱۳۳/۴۶۴، نظیر آباد، لکھنؤ۔ یو۔ پی

جناب اشفاق علی صاحب کو ملا احمد جیونؒ کے ہم وطن ہونے کا فخر حاصل ہے، اس تعلق اور ملا صاحب کی عظمت کی بنا پر وہ ان کی زندگی اور علمی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے ایم۔ فل کا مقالہ ہے، اس میں ملا صاحب کی شخصیت کے خط و خال نمایاں کرنے کے لیے ان کے عہد و ماحول کا جائزہ لیا ہے، اس کے مقدمہ میں ملا جیون کے حالاتِ زندگی اور تصانیف کے علاوہ عہد عالمگیری کی سیاسی، انتظامی، علمی اور تعلیمی حالت بھی بیان کی ہے۔ اور آخر میں اس دور کے علمائے کبار کے ناموں کی فہرست اور بعض کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے، مقالہ کی پابندیوں کی وجہ سے مصنف کو اختصار سے کام لینا پڑا ہے، اس لیے اس موضوع پر جیسی کتاب ہونی چاہیے وہ نہ ہو سکی ہے تاہم اس سے ملا جیون کے ہمعصر علماء کا سرسری اور اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ عہد عالمگیری کے ممتاز اور صاحب تصانیف علما میں تھے۔ ان کی کتابیں عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ ابھی تک ان پر

کوئی باوزن کتاب شائع نہیں ہو سکی ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، آیندہ ایڈیشن میں الذین احسنو االحسنی اور زیارت (ص ۹۷) کی اس طرح ضرور تصحیح کر لی جائے للذین احسنو االحسنیٰ وزیادۃ۔ یہ قرآن مجید کی آیت ہے۔

تصورِ آخرت اور ہندوستانی روایات:۔ مرتبہ جناب محمد فاروق خانصاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۶، قیمت ایک روپے پچاس پیسے، پتہ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی۔ ۶۔

گو عقیدۂ آخرت اسلام کا خاص امتیاز ہے، مگر یہ تصور دوسرے مذہبوں اور قوموں میں بھی موجود تھا اور اب بھی انکی قدیم کتابوں سے اسکے آثار محو نہیں ہوئے ہیں، اس مختصر کتاب میں ہندو مذہب کی قدیم کتابوں اور ہندوستانی روایات کا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ ان میں بھی آخرت کی جھلک پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں آخرت کے مخالف عقائد کی تردید بھی کی ہے اور ہندوستان میں رائج بعض عقائد آواگون وغیرہ کو خود ہندو مذہب کی کتابوں کے حوالے سے باطل قرار دیا ہے، پھر موت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ کے متعلق قدیم ویدوں، شاستروں، پران، مہابھارت، گیتا اور اپنشد وغیرہ مختلف مذہبی کتابوں میں جو کچھ صراحت اور ثبوت موجود ہے، اسے انکے حوالہ سے تحریر کیا ہے، یہ رسالہ مرتب کر کے مصنف نے ایک بہت مفید دینی و تبلیغی خدمت انجام دی ہے، جو ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کئے جانے کے لائق ہے۔

وصایا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی:۔ انتخاب و ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۵۲، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے، پتہ کتب خانہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ۔

مشہور امام طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے وصایا کا ایک قلمی نسخہ کتبخانہ مدرسہ فیض الاسلام پھلت میں موجود تھا جو حسن اتفاق سے مولانا نسیم احمد فریدی کی نظر سے گذرا، وہ اہل اللہ اور بزرگوں کے ارشادات و فرمودات کے بڑے قدرداں اور سلوک و معرفت کے خاص لذت آشنا ہیں، اسلئے انکی کوشش و توجہ سے حضرت سہروردیؒ کی وصیتوں کا ترجمہ و تلخیص پہلے ماہنامہ الفرقان میں قسطوار شائع ہوا، اور اب کتابی صورت میں چھپا ہے، گو حضرت سہروردیؒ نے یہ وصیتیں اور نصیحتیں اپنے بعض مریدین خلفاء اور متعلقین کو کی تھیں، مگر ان میں عقائد و اخلاق اور اعمال و کردار کو سنوارنے کی تلقین اور تصوف و عرفان اور شریعت و طریقت کے اسرار و رموز کا بیان بھی ہے اور سلسلۂ سہروردیہ کی بعض امتیازی باتوں کا تذکرہ بھی ہے، جن کے مطالعہ سے ہر شخص کو فائدہ ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۳۲ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۳ء عدد ۵

مضامین